فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۸۹

جنوری ۱۹۶۲ء تا جون ۱۹۶۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری	۴۳، ۱۰۴، ۲۰۹، ۲۹۱، ۳۴۹، ۴۴۵
۲	جناب ڈاکٹر اکمل صاحب ایوبی ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۱۴۷-۳۹۳
۳	جناب انیل پرشاد صاحب جلیل حیدرآباد دکن	۳۷۸
۴	جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش	۱۶۵-۲۶۹، ۳۶۶، ۴۲۹
۵	جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے، علیگ	۲۴۲-۲۴۵، ۳۲۵، ۴۰۵
۶	جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین	۷۷-۲۳۷، ۴۶۹
۷	جناب عبدالرزاق صاحب قریشی بمبئی	۶۱-۱۳۱، ۱۹۲-۲۳۷
۸	جناب خواجہ عبدالرشید صاحب کراچی	۴۶۱
۹	جناب مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم	۲۲۳
۱۰	جناب پروفیسر عطاء الرحمن صاحب کاکوی صدر شعبۂ فارسی دانشگاہ پٹنہ	۴۶۴
۱۱	جناب غلام رسول صاحب مہر لاہور	۲۳۴-۳۹۵
۱۲	جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد	۳۱۱
۱۳	جناب مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی	۱۵۷-۳۱۶، ۳۹۷-۴۷۵
۱۴	جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب حیدرآباد سندھ	۲۹-۱۳۶

فہرست مضامین معارف

جلد ۸۹

جنوری سنہ ۱۹۶۲ء تا جون سنہ ۱۹۶۲ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۸۹ - ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۱ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۶۲ء - عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

افسوس ہے کہ ہماری علمی بزم کی ایک پرانی یادگار ڈاکٹر حفیظ سید مرحوم نے گذشتہ مہینہ انتقال کیا، انکی پوری زندگی تعلیمی اور علمی مشاغل میں گذری، آخر میں الہ آباد یونیورسٹی کی اردو کی پروفیسری سے رٹائرڈ ہوئے تھے، وہ مشہور صاحب قلم تھے، اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں سیکڑوں مضامین ان کی یادگار ہیں، مستقل کتابیں بھی کئی ہیں، مشہور شاعر قاضی محمود بحری کا کلیات تصحیح و ترتیب کے جملہ لوازم کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا تھا، ان کو تصوف اور روحانیات سے خاص دلچسپی تھی، اس ذوق میں انھوں نے مختلف مذاہب کے روحانی مرکزوں اور انکی روحانی شخصیتوں سے بھی استفادہ کیا تھا، مگر آخر میں اپنے اصلی مرکز کی طرف لوٹ آئے تھے اور اسی پر ان کا خاتمہ ہوا، مرحوم علامہ شبلی کے صحبت یافتہ اور ارکان دار المصنفین کے پرانے رفقاء میں تھے، اسلیے دار المصنفین سے ان کو دیرینہ مخلصانہ تعلق تھا، اسکی مجلس عاملہ اور مجلس انتظامیہ کے رکن بھی تھے، ادھر کئی سال سے فالج میں مبتلا تھے، گذشتہ مہینہ آنکھ کھلوانے کے لیے سیتاپور گئے تھے، وہیں دفعۃً انتقال کیا اور الہ آباد میں تجہیز و تکفین ہوئی۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

ہندستان کے مختلف فرقوں میں کلچرل اتحاد کا نعرہ نہ صرف فرقہ پروروں بلکہ کبھی کبھی کانگریسیوں کی زبان سے بھی سننے میں آتا ہے، فرقہ پرست کھل کر اس کا مطالبہ کرتے ہیں اور کانگریسی خوشنما الفاظ کے پردہ میں، ہم اس مسئلہ پر بارہا لکھ چکے ہیں، آج بعض دوسرے پہلوؤں سے اس کا جائزہ لینا ہے، کلچر ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں مذہبی عقائد سے لیکر تہذیب و معاشرت تک سب داخل ہیں اور مذہب کلچر کا ایک اہم عنصر ہے، اس کے بہت سے مظاہر کا تعلق مذہب سے ہے، اس لیے ہر قوم کے کلچر کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو اس کو دوسرے کلچروں سے ممتاز کرتا ہے اور اسی پر اس قوم کے انفرادی وجود کا دارومدار ہوتا ہے، اگر یہ مزاج بدل جائے تو اس کا انفرادی وجود

ختم ہو جائے، اسلیے کوئی قوم بھی کسی دوسری قوم کا کلچر قبول نہیں کر سکتی، اسی لیے ساری دنیا کی جمہوریتوں کے دستور میں اقلیتوں کے مذہب کے ساتھ ان کے کلچر اور زبان کے تحفظ کی بھی پوری ضمانت ہوتی ہے، اور ہندوستان کے دستور میں بھی یہ ضمانت موجود ہے، اس لیے کلچرل اتحاد کا مطالبہ اقلیتوں کے دستوری حق اور اتحاد و یکجہتی دونوں کے خلاف ہے، اس سے یکجہتی کے بجائے اختلاف و تفریق پیدا ہوتی ہے۔

اس سے قطع نظر ہندوستان کے مختلف خطوں اور خود ہندوؤں کے مختلف طبقوں میں اسقدر کلچرل اختلافات ہیں کہ ان میں لفظ ہندو کے علاوہ اور کوئی چیز مشترک نہیں ہے، جنوبی ہند کا کلچر شمالی ہند سے بالکل مختلف ہے، بلکہ ایک ہی صوبہ اور ایک ہی مقام کی مختلف ذاتوں اور اعلیٰ و ادنیٰ طبقوں کے کلچر میں بڑا اختلاف ہے، ایسی حالت میں اقلیتوں سے کلچرل اتحاد کے مطالبہ کے کوئی معنی نہیں ہیں، پھر کلچر کے تہذیبی پہلو ترقی پذیر ہیں اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ بدلتے اور ترقی کرتے رہتے ہیں، اور کلچرل اتحاد کے نعرہ کا مقصد قدیم ہندوستان کے کلچر کا احیاء ہے، اگر مسلمانوں اور انگریزوں کے دور کی تہذیبی و معاشرتی ترقیوں کو چھوڑ کر پراچین بھارت کا کلچر زندہ کیا جائیگا، تو اس زمانہ میں اسکی قدر و قیمت کیا ہوگی اور اس کو دنیا کے سامنے ایک ترقی یافتہ کلچر کی حیثیت سے کس طرح پیش کیا جائیگا، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی کلچر کی ساری خوبی اور سارا حسن اسکی رنگا رنگی میں ہے، اسی سے اسکی عظمت قائم ہے، اگر اس کو ختم کر دیا جائیگا تو وہ اس زمانہ کیلیے مضحکہ بن جائیگا۔

واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف قومی اتحاد و یکجہتی بلکہ انسانیت و شرافت، اخوت و یگانگت سب کا اصلی سرچشمہ صحیح مذہب ہے، اس لیے انہی لوگوں میں حقیقی یگانگت پیدا ہو سکتی ہے جو اپنے مذہب کے پورے پابند اور اپنے کلچر کے نمائندے ہوں، پہلے بھی انہی میں یگانگت رہی ہے اور آیندہ بھی انہی میں ہوگی، اتحاد و یکجہتی کے سیاسی نعرہ سے پہلے ان ہندو مسلمانوں میں آج سے زیادہ اتحاد اور بھائی چارہ تھا جو اپنے مذہب اور کلچر کے صحیح نمائندے تھے، جنکی بچی کھچی ہوئی یادگاریں اب بھی باقی ہیں، اختلاف اور تفریق اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب سے سیاست نے مذہب کی جگہ لی ہے اور نام نہاد آزادی، روشن خیالی اور رواداری کا آغاز ہوا ہے۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں میں ملک و وطن کے سچے وفادار اور فدائی قومی اتحاد و یکجہتی کے سب سے

بڑے علمبردار اور جنگ آزادی کے سرفروش مجاہد وہی لوگ تھے جو اپنے مذہب اور کلچر کے نہ صرف نمایندے بلکہ اس کے محافظ و نگہبان بھی تھے، علما میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا کفایت اللہ، مولانا ابو الکلام، مولانا احمد سعید، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سجاد، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، غیر علما میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، تصدق احمد خاں شروانی اور ڈاکٹر سید محمود کی قوم پروری اور وطن دوستی سے کون انکار کرسکتا ہے، اور یہ سب کے سب نہ صرف اپنے مذہب اور کلچر کے نمایندے بلکہ اس کے محافظ اور پاسبان بھی تھے، یہ صرف چند نامور لوگوں کے نام ہیں، ورنہ وطن پروروں کی اکثریت اسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے، علماء میں مولانا ابو الکلام آزاد سب سے زیادہ آزاد خیال اور ترقی پسند تھے لیکن وہ بھی اسلامی تہذیب و روایات کے محافظ تھے اور رام گڑھ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے انھوں نے بہ بانگ دہل یہ اعلان کیا تھا کہ

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے، اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں، اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے"۔

یہ اس شخص کے خیالات ہیں جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ قوم پرور اور وطن دوست تھا جس کی پوری زندگی قوم و وطن کی وفاداری اور جان نثاری میں گذری جس کی ذات قومی اتحاد و یکجہتی کا مجسم پیکر تھی، مگر وہ بھی اپنی تہذیب و روایات کا کوئی حصہ بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا، مگر اب ان ملفوظات کو کون سنتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کلچرل اتحاد کا نعرہ قوم و ملک کے ساتھ دوستی نہیں بلکہ انتہائی دشمنی ہے، اور جو مسلمان اس کی ہمنوائی کریں وہ منافق ہیں، قومی اتحاد و یکجہتی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر ملت کے کلچر اور تہذیب و روایات کو زندہ رہنے اور نشو و نما حاصل کرنے کا پورا موقع دیا جائے، اس کے بغیر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

مقالات

"دین رحمت"

(۴)

از شاہ معین الدین احمد ندوی

ترتیب کے لحاظ سے یہ مضمون کتاب کے آخر کا حصہ ہے، لیکن دوسرے مذاہب کے متعلق اسلام کی تعلیمات اور ان کی رو سے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت اور ان کے طرز عمل کے بارہ میں بعض سوالات کے جواب میں اس کو پہلے شائع کیا جاتا ہے، اصل کتاب میں انشاء اللہ اس سے زیادہ مکمل شکل میں ہوگا۔ "م"

یوں تو اسلام ہر پہلو سے عالم انسانیت کے لیے سراسر رحمت ہے لیکن اس کی بعض تعلیمات ظاہری اور معنوی دونوں پہلو سے رحمت ہیں، اور دوست و دشمن دونوں ان کے رحمت ماننے پر مجبور ہیں، مثلاً انسانی مساوات، اخوت، خدمت خلق، انسان دوستی، عدل و مساوات، حقوق نسوانی وغیرہ، ان کے رحمت ہونے سے ایک ملحد بھی انکار نہیں کرسکتا، اور بعض معنوی یا داخلی حیثیت یعنی اپنے نتائج کے اعتبار سے رحمت ہیں، مثلاً توحید، رسالت اور حشر و نشر، جن کے ملحدین سرے سے منکر ہیں، اور مشرک قومیں بھی توحید و رسالت کی قائل نہیں، اس لیے وہ ان کو رحمت نہیں مانتی ہیں، حالانکہ یہ دونوں نتائج کے اعتبار سے سراسر رحمت ہیں، توحید ہی نے انسانوں کا درجہ بلند کیا اور ان کو اپنے ابنائے جنس اور معبودان باطل

کی غلامی سے رہائی دلائی اور دنیا نے انبیاء علیہم السلام کے وسیلہ ہی سے خدا کو پہچانا اور آج اخلاق و روحانیت کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ انہی نفوس قدسیہ کا فیض ہے، اس لیے یہ دونوں عالم انسانیت کے لیے سراسر رحمت ہیں، موجودہ دنیا میں کسی مذہب کے رحمت ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس نے انسانوں کے ساتھ مساوات و مواسات، رحم و کرم اور لطف و مدارات کی کیا تعلیم دی ہے، اور اس کی تعلیمات دنیاوی حیثیت سے کہاں تک ان کے لیے رحمت ہیں، اس لیے اسلام کی رحمت کے باطنی پہلو دکھانے کے بعد اب اس کے ظاہری پہلوؤں کو پیش کیا جاتا ہے، انسانی مساوات کی تعلیم کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، اب اس کے بعض اور پہلو پیش کیے جاتے ہیں، اسلام نے ساری مخلوق کو خدا کا کنبہ قرار دیا ہے، اور خدا کی نگاہ میں وہی انسان پسندیدہ ہے جس کا معاملہ اس کی مخلوق کے ساتھ اچھا ہے،

الخلق کلھم عیال اللہ فاحب	ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک
الخلق الی اللہ من احسن الی	سب سے پسندیدہ خلق وہ ہے جو اس کے کنبہ (یعنی مخلوق)
عیالہ (طبرانی و بیہقی)	کے ساتھ بھلائی کرتا ہے،

خدا ان ہی لوگوں پر رحم کرتا ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں،

الراحمون یرحمھم الرحمن ارحموا	رحم کرنے والوں پر خدائے رحمن رحم کرتا ہے
من فی الارض یرحمکم من فی	اس لیے تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا
السماء (ترمذی)	تم پر رحم کرے گا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے،

من لا یرحم الناس لا یرحمہ	جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا
اللہ (ادب المفرد باب من لا یرحم لا یرحم)	رحم نہیں کرتا،

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

تم اس وقت تک مومن نہیں کہلا سکتے جب تک آپس میں محبت نہ کرو، میں تم کو بتاؤں آپس میں محبت کا ذریعہ کیا ہے، لوگوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! فرمایا ایک دوسرے کو سلام کرو تم میں محبت پیدا ہو جائے گی، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اس وقت تک تم جنت میں داخل نہ ہو سکو گے جب تک آپس میں محبت کا برتاؤ نہ کرو، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم سب رحم کرتے ہیں، فرمایا کسی ایک شخص کی رحمت نہیں بلکہ رحمت عام مطلوب ہے۔" (مستدرک حاکم ج ۴ ص ۱۶۷-۱۶۸)

ایک روایت میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک دوسرے لوگوں کے ساتھ وہی پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لیے کرتا ہے اور جب تک وہ دوسرے کے ساتھ محض اللہ عزوجل کے لیے محبت نہ کرے۔ (مسند احمد بن حنبل ج ۳ ص ۲۷۲)

بخاری کی روایت ہے کہ "آپس میں بغض و حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو اور سب خدا کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔" (بخاری کتاب الادب باب الہجرۃ)

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے پڑوسی (یا فرمایا) اپنے بھائی کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔" (مسلم کتاب الایمان ج ۲ ص ۳۱ مطبوعہ مصر)

رحم و محبت سے محروم شقی ہی ہوتا ہے

لا تنزع الرحمۃ الا من شقی	صرف شقی ہی رحمت سے محروم ہوتا ہے۔

(ابو داؤد باب الرحمۃ)

بندوں کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ خدا کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ ہے، حدیث قدسی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن فرمائے گا کہ اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی، بندہ عرض کرے گا پروردگار میں تیری عیادت کس طرح کرتا'

تو تو خود سارے جہان کا پروردگار ہے، خدا فرمائے گا کیا تجھکو نہیں معلوم میرا فلاں بندہ بیمار پڑا اگر
گر تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تو عیادت کرتا تو مجھکو اس کے پاس موجود پاتا، اے ابن آدم
میں نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا پروردگار تو تو خود رب العٰلمین ہے میں
تجھکو کھانا کس طرح کھلاتا، خدا فرمائے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا، مگر تو نے نہیں کھلایا،
اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کھانے کو میرے پاس موجود پاتا، اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے
نہیں پلایا، بندہ عرض کرے گا پروردگار میں تجھ کو کس طرح پانی پلاتا تو تو خود رب العٰلمین ہے، خدا
فرمائے گا فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تو نے نہیں پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس موجود پاتا۔"
(مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب باب فی فضل عیادۃ المریض)

اس حدیث سے خلق خدا کے ساتھ رحم وکرم اور لطف ومدارات کے بارہ میں اسلامی نقطۂ نظر کی
پوری وضاحت ہو جاتی ہے، اس نے درجہ بدرجہ سب انسانوں کے ساتھ احسان وسلوک کا حکم دیا ہے،
خصوصاً صلہ رحم یعنی ان اعزہ کے ساتھ جن کا نسب مشترک ہے احسان وسلوک کی بڑی تاکید ہے،
حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

الرحم شجنۃ من الرحمٰن فقال اللہ من وصلک وصلتہ ومن قطعک قطعتہ (بخاری کتاب الادب باب من وصل وصل اللہ)

رحم رحمٰن کی جڑ سے نکلی ہوئی شاخ ہے، اللہ تعالیٰ نے (رحم سے) فرمایا کہ جو شخص تجھکو جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا اور جو تجھکو کاٹے گا میں اس کو کاٹوں گا،

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں رحمٰن ہوں،
میں نے رحم پیدا کیا ہے اور اس کو اپنے نام (یعنی رحمٰن) سے مشتق کیا، بس جو شخص اس کو جوڑے گا
میں اس کو جوڑوں گا اور جو اس کو کاٹے گا میں اس کو کاٹوں گا (ادب المفرد باب فضل صلۃ الرحم)

صلہ رحم جنت کی کنجی اور آتش دوزخ سے نجات کا ذریعہ ہے، ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ایسا عمل بتائیے جو جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کرے، فرمایا
اللہ کی عبادت کرو اور اس میں کسی کو شریک نہ کرو، نمازیں قائم کرو، زکوٰۃ دو اور صلہ رحم کرو۔ (ادب
المفرد باب صلۃ الرحم)

صلہ رحم سے رزق میں وسعت اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ جو یہ چاہتا ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی اور موت میں تاخیر ہو تو اس کو صلہ رحم کرنا چاہیے (بخاری
کتاب الادب باب من بسط فی الرزق لصلۃ الرحم)
اس کی مزید تفصیل آئندہ آئے گی،

اپنوں کے ساتھ حسن سلوک، احسان وکرم اور لطف ومدارات تو فطرت سلیم کا طبعی تقاضا ہے،
اس کا اصل معیار غیروں اور دشمنوں کے ساتھ طرز عمل ہے، اور آج کل کے ذوق ورجحان کے مطابق
اس سلسلہ میں سب سے مقدم سوال دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ معاملت کا آتا ہے، اس لیے پہلے اسی پر
گفتگو کیجاتی ہے، عام دشمنوں کے متعلق احکام پر آئندہ بحث کی جائے گی، اسلام دوسرے مذاہب کے
ساتھ جس قدر رواداری ہے اس کی مثال دوسرے مذاہب کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، اس نے ان سے
اختلاف اور مخالفت کے بھی حدود مقرر کر دیے ہیں۔

کلام مجید میں کفار ومشرکین اور یہود ونصاریٰ کے ساتھ جنگ وقتال کی جو آیات ہیں ان سے ناواقفوں
کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ اسلام تمام مذاہب کا دشمن اور ان کے پیرووں کے ساتھ غیر روادار ہے، مگر یہ غلط فہمی
ان آیات کے پس منظر سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ غیر مسلموں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو اسلام
اور مسلمانوں کے معاند اور ان کے دشمن ہیں اور ان کو مٹا دینا چاہتے ہیں، دوسرے وہ جن کو ان سے کوئی
مخاصمت اور دشمنی نہیں ہے، ان دونوں کے احکام جدا جدا ہیں۔

کفار و مشرکین کے ساتھ جنگ و قتال کے جو احکام ہیں ان کا پس منظر یہ ہے کہ اسلام ایک انقلابی مذہب ہے، جس نے ان تمام مذاہب کے پیرووں میں جن کی روح ختم ہو چکی تھی، اور وہ محض اوہام و خرافات کا مجموعہ بن گئے تھے، ایک زلزلہ پیدا کر دیا تھا، اور ان سب نے متحد ہو کر اس کی مخالفت شروع کر دی، اسلام کے ظہور کے وقت عرب میں تین مذاہب تھے، دین ابراہیمی کی جانب منسوب کفار و مشرکین، یہودی اور عیسائی، مگر ان میں سے ایک بھی اپنے اصل مذہب پر قائم نہ تھا، کفار و مشرکین میں خانہ کعبہ کے احترام اور اس کے حج کے سوا دین ابراہیمی کا کوئی اور اثر باقی نہ رہ گیا تھا، اس میں بھی انھوں نے بہت سے خرافات شامل کر دیے تھے، دین ابراہیمی جس کی تعلیم توحید خالص تھی اس کے پیرو سیکڑوں بتوں کی پوجا کرتے تھے، خانہ کعبہ جس کی بنیاد ابراہیم خلیل اللہ نے خدائے واحد کی پرستش کے لیے رکھی تھی بتوں کا استھان بن گیا تھا، اخلاقی حالت مذہبی حالت سے بھی ابتر تھی اور مشرکین طرح طرح کی بد اخلاقیوں میں مبتلا تھے،

مشرکین کے بعد دوسرا نمبر یہودیوں کا تھا، وہ اہل کتاب تھے، اس لیے بت پرست تو نہیں تھے لیکن ان کی مذہبی روح بھی بالکل ختم ہو چکی تھی اور یہودی مذہب محض بے جان رسوم کا مجموعہ بن گیا تھا اور یہودیوں نے اسکو ایک تماشا بنا لیا تھا، اپنی خواہش کے مطابق جس طرح چاہتے تھے اس کو موڑ دیتے تھے، اور بد اخلاقی میں مشرکین سے کم نہ تھے، سود خواری نے ان کو بڑا حریص اور سنگدل بنا دیا تھا، لیکن اہل کتاب تھے، ان پڑھ مشرکین کے مقابلہ میں تعلیم یافتہ اور سود خواری کی وجہ سے دولت مند تھے، اس لیے ان کو مشرکین کے مقابلہ میں مذہبی امتیاز اور مالی اقتدار حاصل تھا، عیسائیوں کی تعداد عرب خصوصاً حجاز میں بہت کم تھی، اس لیے ان کو کوئی خاص پوزیشن حاصل نہ تھی، لیکن ان کی مذہبی حالت بھی بگڑ چکی تھی۔

اسلام کا مقصد دین ابراہیمی کے پورے سلسلہ کی اصلاح اور تجدید و تکمیل تھی، اور اس کی دعوت توحید خالص تھی، اس لیے براہ راست تو ان کی ٹکر کفار و مشرکین سے تھی لیکن قرآن مجید نے یہودیوں کے عیوب بھی واشگاف بیان کیے تھے، جس سے ان کے مذہبی وقار کو صدمہ پہنچتا تھا، اور اسلام کے

قوت بکھرنے سے ان کے دنیاوی اقتدار کا بھی خاتمہ ہوا جاتا تھا، اس لیے وہ بھی اسلام اور مسلمانوں کے دشمن بن گئے، اور ابتدا میں کفار و مشرکین نے اور بعد میں دونوں نے مل کر ان کی دشمنی اور بیخکنی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور جب تک ان میں دم رہا ان کے استیصال کے درپے تھے، بعد میں عیسائی بھی ان کے شریک بن گئے، خصوصاً اسلام کے جزیرۃ العرب سے باہر قدم نکالنے کے بعد زیادہ مقابلہ انہی سے رہا جو صدیوں جاری رہا، جس کے اثرات آج تک باقی ہیں،

کلام مجید میں کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے جنگ و قتال کے جو احکام ہیں وہ درحقیقت انہی سے متعلق ہیں جو مسلمانوں کے دشمن تھے اور ان کو مٹا دینا چاہتے تھے، ایسی حالت میں، اسلام اور مسلمانوں کی بقا کے لیے ان کا مقابلہ کرنا ناگزیر تھا، اور آج بھی جو غیر مسلم مسلمانوں کے دشمن اور ان کے استیصال کے درپے ہوں ان کے بارہ میں بھی یہی حکم ہے، لیکن جو غیر مسلم مسلمانوں کے دشمن اور ان کے درپے آزار نہیں ہیں ان کا حکم جدا ہے، ان کے ساتھ دنیاوی تعلقات اور حسن سلوک کی ممانعت نہیں ہے۔

لَا یَنْهٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ
فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ
اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْهِمْ
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۔ اِنَّمَا
یَنْهٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قَاتَلُوْکُمْ
فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ
وَظَاهَرُوْا عَلٰی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ
وَمَنْ یَتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ
الظّٰلِمُوْنَ (الممتحنة - ۲)

مسلمانو! جو لوگ تم سے دین کے بارہ میں جنگ نہیں کرتے اور جنھوں نے تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ احسان و سلوک اور عدل و انصاف کا برتاؤ کرنے سے اللہ تم کو منع نہیں کرتا، اللہ تم کو انہی لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جو دین کے بارہ میں تم سے لڑے اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالا اور تمھارے نکالنے میں مخالفوں کی مدد دی، جو ایسے لوگوں سے دوستی رکھے گا وہ ظالموں میں ہوگا۔

برسرِ جنگ کفار و مشرکین سے مقابلہ کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے، لیکن جب وہ صلح کے لیے ہاتھ بڑھائیں تو صلح کرلینا چاہیے۔

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ (انفال-۸)

اور اگر کافر صلح کے لیے جھکیں تو تم بھی صلح کیلئے جھکو اور اللہ پر بھروسہ رکھو کیونکہ وہی سنتا اور جانتا ہے اور اگر ان کا ارادہ دھوکا دینے کا ہو تو اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔

اسلام اور دوسرے مذاہب

اسلام سے پہلے کے سارے مذاہب اپنے علاوہ دوسرے مذاہب کو باطل اور ان کے ماننے والے ایک دوسرے کو گمراہ سمجھتے تھے اور ان کے جانی دشمن تھے، حتیٰ کہ یہودی اور عیسائی تک جو ایک ہی درخت (دین ابراہیمی) کی شاخیں ہیں، ایک دوسرے کو جھوٹا سمجھتے تھے،

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَى عَلَى شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَى شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ (بقرہ-۱۴)

اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا مذہب کچھ نہیں ہے، اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کا مذہب کچھ نہیں ہے، حالانکہ دونوں کتاب الٰہی پڑھنے والے ہیں۔

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کو نعوذ باللہ کذاب اور فریبی سمجھتے تھے، انھی نے اپنے گمان میں آپ کو سولی پر چڑھوایا تھا، یہی حال عیسائیوں کی یہود دشمنی کا تھا اور جہاں تک ان کا بس چل سکا یہودیوں کے استیصال کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور جب تک پوپ کے مذہب کا اثر ختم نہیں ہوگیا ان پر عرصۂ زمین تنگ تھا، ہندو اپنے علاوہ ساری دنیا کو ملیچھ سمجھتے تھے، یہی حال ایرانیوں کے احساس برتری کا تھا، سب سے پہلے اسلام نے یہ نفرت دور کی اور یہ بتایا کہ دنیا کی کوئی قوم بھی فیضان نبوت سے محروم نہیں، ہر قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پیغمبر مبعوث ہوئے

برسرِ جنگ غیر مسلموں سے مقابلہ کا تو پورا حکم ہے، مگر ان کے ساتھ بھی ظلم و زیادتی کی ممانعت ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (بقرہ-۲۲)

جو لوگ تم سے لڑیں تم بھی اللہ کے راستہ میں ان سے جنگ کرو، مگر کسی قسم کی زیادتی نہ کرو، اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

دوسری آیت میں ہے

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَنْ صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ تَعْتَدُوا وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (مائدہ-۲)

جن لوگوں نے تم کو مسجد حرام سے روکا تھا (صلح حدیبیہ میں مشرکین نے مسلمانوں کو خانہ کعبہ کی زیارت سے زبردستی روکا تھا) انکی عداوت تم کو ان پر زیادتی کرنے کا سبب نہ بنے، نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار ہو جایا کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں مددگار نہ بنا کرو۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نیک اور اچھے کاموں میں غیر مسلموں سے اشتراکِ عمل کی پوری اجازت ہے۔

دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف سے کام لینا چاہیے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (مائدہ-۱)

اے ایمان والو انصاف کی گواہی دینے کے لیے اللہ کے واسطے تیار ہو جایا کرو، کسی قوم کی دشمنی کی بنا پر انصاف کو نہ چھوڑو، انصاف کیا کرو یہ بات تقویٰ سے زیادہ قریب ہے، اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ جانتا ہے جو کام تم کرتے ہو۔

کلام مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ (روم)

اور ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی رسول ان کی اپنی قوم کی رہنمائی کے لیے بھیجے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ هَادٍ (رعد-۱)

اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما آیا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس-۵)

اور ہر قوم کے لیے ایک رسول آیا۔

اور مسلمانوں کے لیے ان تمام انبیاء و رسل اور ان کی کتابوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا اور ان میں کوئی تفریق گوارا نہیں کی۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (بقرہ-۴۰)

ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا اور ہم خدا کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔

اس سے انکار کفر و ضلالت ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (نساء-۲۰)

اور جو شخص خدا کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا انکار کرتا ہے وہ سخت گمراہی میں مبتلا ہے۔

اس لیے اسلام سے پہلے کے انبیاء و رسل اور ان کی کتابوں پر مسلمانوں کے لیے ایمان لانا ضروری ہے، اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں کہلا سکتے، لیکن انبیاء علیہم السلام کی تعداد اتنی ہے کہ ان سب کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہو سکتا تھا، جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ

اور ہم نے یقیناً بہت سے پیغمبر بھیجے ان میں سے کچھ حال تم سے بیان کیا اور کچھ کا نہیں

مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ

بیان کیا۔

یہودیت، عیسائیت اور اسلام تینوں دین ابراہیمی کی شاخیں ہیں، اور دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں اور ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور عرب ان سے زیادہ واقف تھے، گو قرآن مجید کا خطاب ساری دنیا سے ہے، لیکن اس کے مخاطب اول عرب تھے، اور اسلام کا مقصد سلسلہ ابراہیمی کے ادیان کی اصلاح اور اس سلسلہ کی تکمیل تھی، اس لیے کلام مجید میں زیادہ تر سلسلۂ ابراہیمی کے پیغمبروں اور ان کی کتابوں خصوصاً یہودیوں اور عیسائیوں کے پیغمبروں اور انکی کتابوں کا تصریح و تفصیل کے ساتھ تذکرہ ہے، اور ان کے پیروؤں کے ہاتھوں ان کے عقائد میں جو تبدیلیاں اور کتابوں میں جو تحریفیں ہوئی تھیں ان کی نشاندہی اور تصحیح کی گئی ہے اور ان پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور جن پیغمبروں اور ان کی کتابوں کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، اور ان کی قوم ان کو پیغمبر مانتی ہے ان کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ توحید کی تعلیم دیتے ہیں، کیونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اولین مقصد توحید اور خداشناسی کی تعلیم ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (نحل-۵)

اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو اور جھوٹے معبودوں سے بچو،

...... وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء۲)

اور ہم نے تم سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، اس لیے مجھی کو پوجو۔

اس لیے اسلامی عقیدے کی رو سے دنیا کی کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے جس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پیغمبر نہ مبعوث ہوئے ہوں، لیکن آج دنیا میں جس قدر قدیم مذاہب ہیں ان کے پیغمبروں کے حالات انسانوں میں ایسا گم ہیں اور ان کی تعلیمات میں اتنی تحریف ہوگئی ہے کہ ان کی اصل حقیقت کا

پتہ چلانا مشکل ہے، اس لیے کلام مجید میں جن پیغمبروں کا ذکر ہے ان پر تو ہر مسلمان کے لیے ایمان لانا ضروری ہے لیکن جن کا ذکر نہیں ہے ان کو پورے اذعان و یقین کے ساتھ تو پیغمبر نہیں کہا جا سکتا، اس لیے ان کو پیغمبر ماننا بھی ضروری نہیں ہے کیونکہ پیغمبر ماننے کے بعد ان پر ایمان لانا بھی ضروری ہے، اور اسلام کے ایمانیات میں وہی چیزیں ہیں جن پر قرآن مجید نے تصریح کے ساتھ ایمان لانے کا حکم دیا ہے۔ لیکن ان کی موٹی سی پہچان یہ ہے کہ جو قومیں جن برگزیدہ شخصیتوں کو اپنا پیغمبر مانتی ہیں ان کی تعلیم میں اگر توحید ہے اور وہ دوسرے اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے متصف ہیں تو ان کو خدا کا برگزیدہ بندہ بہر حال ماننا چاہیے اور ان کی عظمت و احترام میں فرق نہ کرنا چاہیے،

مگر اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان تمام مذاہب کو جو مذہب کے نام سے موسوم ہیں خواہ ان کے عقائد کیسے ہی ہوں یکساں سمجھا جائے، اور توحید، شرک، الحاد، خرافیات اور توہم پرستی سب کو ایک درجہ پر رکھا جائے، اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ کسی مذہب پر پختہ عقیدہ اور کامل ایمان نہیں ہے، کامل ایمان کے معنی یہی ہیں کہ اپنے عقیدہ کو سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ سچا اور انسانی ہدایت و رہنمائی کے لیے سب سے زیادہ کامل اور مکمل سمجھا جائے۔ خصوصاً جن مذاہب کے مثبت و منفی بنیادی عقائد ہیں مثلاً اسلام یہودیت اور عیسائیت وہ تمام مذاہب کو ایک سطح پر رکھ ہی نہیں سکتے، اور یہ مذہب ہی پر موقوف نہیں بلکہ دنیاوی معاملات و مسائل میں بھی ایک صاحب بصیرت انسان، اسی چیز کو اپنے لیے پسند کرتا ہے، جس کو سب سے زیادہ صحیح، مفید اور بہتر سمجھتا ہے، اور عقیدہ و مذہب کا معاملہ تو اس سے کہیں بڑھکر ہے، اس لیے سارے مذاہب کو ایک سطح پر رکھنے کے کوئی معنی نہیں،

اس سے انکار نہیں کہ سارے الہامی مذاہب کا مقصد خدا شناسی، انسانوں کی ہدایت و رہنمائی اور ان کی دنیاوی و اخروی فلاح و سعادت ہے، لیکن امتداد زمانہ اور انسانی تصرفات سے ان میں اتنی تبدیلیاں ہو گئی ہیں کہ اس کی شکل ہی مسخ ہو گئی ہے اور ان کا اصلی مقصد ہی فوت ہو گیا ہے، اس لیے

سارے مذاہب کو ایک سطح پر نہیں رکھا جا سکتا، مذہبی رواداری کا مقصد یہ ہے کہ کسی مذہب کو برا نہ کہا جائے، اختلاف مذہب کی بنا پر کسی انسان سے نفرت نہ کیجائے، اور ان کو انسانی حقوق سے محروم نہ کیا جائے، ان کے معاشرتی حقوق ادا کیے جائیں، کلام مجید میں تو معبودان باطل تک کو برا کہنے کی ممانعت ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ	مسلمانو! جو لوگ خدا کے سوا دوسرے لوگوں
مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا	(معبودوں) کو پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو، ایسا
بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام - ۱۰۸)	نہ ہو کہ یہ لوگ بھی ناحق اور نادانی سے خدا کو برا کہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے کفار و مشرکین تک کو جنھوں نے آپ پر عرصۂ زمین تنگ کر دیا تھا، کبھی برا نہیں کہا اور ان کے لیے یہی دعا کرتے رہے کہ

اللھم اھد قومی فانھم لا	اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ
یعلمون	(حق و باطل) کو نہیں پہچانتے۔

ایک مرتبہ مسلمانوں نے مشرکین کے مظالم سے تنگ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مشرکین کے لیے بددعا کیجئے، آپ نے فرمایا

انی لم ابعث لعانا وانما بعثت	میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ
رحمۃ (مشکوٰۃ باب فی اخلاقہ وشمائلہ)	رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اس لیے غیر مسلموں کو برا نہ کہنا چاہیے بلکہ ان کے لیے ہدایت کی دعا اور اس کی کوشش کرنی چاہیے، آپ ان مشرکین کے ساتھ بھی جنھوں نے آپ کو اور مسلمانوں کو بڑی اذیتیں پہنچائی تھیں، اور اسلام کو مٹانے کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا، ہمیشہ نیکی فرماتے تھے، ابتدائے دعوت میں قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل خاندان کو تبلیغ اسلام کے جرم میں شعب ابی

طالب میں نظر بند کر دیا تھا اور تین سال اتنی سخت ناکہ بندی کی تھی کہ غلہ کا ایک دانہ بھی اندر نہ پہنچنے پاتا تھا، جب بچے بھوک سے بلکتے تو یہ سنگدل ان کی آواز سنکر قہقہے لگاتے تھے، مگر ایک دن وہ بھی آیا کہ خود قریش دانہ دانہ کے لیے آپ کے محتاج ہوگئے، مکہ میں یمامہ سے غلہ آتا تھا، یہاں کے رئیس ثمامہ بن آثال نے اسلام قبول کرلیا، تو قریش نے ان کے تبدیل مذہب پر طعن وطنز کیا، ان کو بہت ناگوار ہوا اور دھمکی دی کہ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ نہ بھیجوں گا، اس بندش سے مکہ میں قحط پڑ گیا، قریش نے مجبور ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض معروض کیا، آپ نے ثمامہ بن اثال کو کہلا بھیجا کہ غلہ نہ روکو، اس حکم پر غلہ آنے لگا (بخاری کتاب المغازی وفد ثمامہ بن آثال وسیرابن ہشام ج ۲ ص ۴۹)

اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن مشرکین مکہ خصوصاً قریش تھے، انھوں نے ان کی ایذارسانی اور اسلام کی بیخکنی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا، یہانتک کہ مسلمانوں کو ترک وطن پر مجبور کر دیا اور وہ مکہ چھوڑکر مدینہ چلے گئے، مگر یہاں بھی مشرکین نے چین نہ لینے دیا، اور مسلسل آٹھ سال تک ان سے جنگ کرتے رہے، بالآخر حق کے مقابلہ میں باطل کو شکست ہوئی اور ۸ھ میں ان کا مرکز مکہ فتح ہوگیا، اور مشرکین مکہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن رحمت کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہ رہ گئی، اگر آپ کے علاوہ کوئی دنیاوی فاتح ہوتا تو کوئی مشرک اور قریشی زندہ نہ بچنے پاتا، مگر رحمت عالمؐ نے عفو عام کا اعلان کر دیا، اور چند مشرکین کے قتل کے علاوہ جنھوں نے خود مسلمانوں پر حملہ کر دیا تھا، عام آبادی کے خون کا ایک قطرہ نہیں گرا، فتح مکہ کے واقعات بہت طویل ہیں، یہاں ان کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے اسلام کی رحمت عام کی چند جھلکیاں دکھائی جاتی ہیں،

جب مسلمانوں کی فوج ظفر موج تطہیر کعبہ کے لیے مکہ کے قریب خیمہ زن ہوئی تو مکہ کے کفار ومشرکین میں ایک عام ہراسیمگی پھیل گئی، ان کے لیے کہیں جائے پناہ نظر نہ آتی تھی، ان کے سرخیل ابوسفیان جو مسلمانوں کی مخالفت میں سب سے آگے رہتے تھے اور ان کے خلاف ہر فتنہ میں ان کا ہاتھ رہتا تھا سب سے

زیادہ گھبرائے، ان سے اور حضرت عباسؓ سے پرانے تعلقات تھے، وہ کسی نہ کسی طرح ان کو عفو تقصیر کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے، آپ نے اس سب سے بڑے دشمن اسلام کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اس کی عزت افزائی بھی فرمائی جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

ابوسفیان مسلمانوں کے خلاف کئی لڑائیوں میں مشرکین کی قیادت کر چکے تھے، اس لیے مکہ میں اسلامی فوج کے داخلہ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کو ایک بلند مقام پر لیجا کر کھڑا کر دیا جائے تاکہ آج وہ افواج الٰہی کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، اور اسلامی فوج کے دستے یکے بادیگرے ان کے سامنے سے گذرنے لگے، انصار کا دستہ اس شان وشوکت سے گذرا کہ اس کو دیکھکر ابوسفیان گھبرا گئے، اس کا پرچم حضرت سعدؓ بن عبادہ انصاری کے ہاتھ میں تھا، ان کی نظر ابوسفیان پر پڑ گئی، انھوں نے ان کو دھمکانے کے لیے کہا کہ "آج بڑے گھمسان کا دن ہے، آج کعبہ حلال کیا جائیگا" یہ سنکر ابوسفیان ڈر گئے، اس کے بعد ہی آخری دستہ اس شکوہ وتجمل کے ساتھ گذرا کہ ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، ابوسفیان کو عبادہؓ کی دھمکی سے پھر جان خطرہ میں نظر آرہی تھی، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا آپ نے سنا سعد بن عبادہ نے جو کچھ کہا؟ آپ نے فرمایا کیا کہا ہے، انھوں نے بتایا کہ "آج گھمسان کا دن ہے، آج کعبہ حلال کیا جائے گا"۔ فرمایا انھوں نے غلط کہا، آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے اور اس پر غلاف چڑھایا جائے گا۔ (بخاری کتاب المغازی باب این رکز النبی صلی اللہ علیہ وسلم الرایۃ یوم الفتح)

مکہ میں داخلہ کے وقت افسران فوج کو جنگ وخونریزی کی ممانعت فرمادی،

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امرائے فوج
امر امراءه ان لا يقتلوا الا	کو حکم دیدیا کہ وہ صرف ان ہی لوگوں سے جنگ
من قاتلهم (فتح الباری ج ۸ ص ۹)	کریں جو خود جنگ کی ابتدا کریں۔

مکہ میں داخلہ کے بعد اعلان عام فرمادیا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے یا اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے یا مسجد حرام میں چلا جائے وہ مامون ہے (فتح الباری ج ۸ ص ۱۱ و زاد المعاد ج اول ص ۴۲۳)

مگر احتیاط کے باوجود قریش کے بعض ہ دیگر قبائل نے خالد بن ولید رضؓ کے دستہ پر جو حفاظت کے لیے ایک مقام پر مامور تھا، حملہ کردیا، خالدؓ نے بھی مجبور ہوکر مدافعت کی، اس میں چند مشرکین مارے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے خالدؓ سے بازپرس کی، انھوں نے عرض کیا کہ انھوں نے خود حملہ کردیا تھا، میں نے جہاں تک ممکن تھا ہاتھ روکے رکھا، یہ سنکر آپؐ نے فرمایا خدا کا فیصلہ بہتر ہے (فتح الباری ج ۸ ص ۹)

مگر اس واقعہ کے سوا عام آبادی سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، مکہ میں داخلہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کیا، اس کے بعد وہ مشہور خطبہ دیا جو خطبۂ فتح کے نام سے موسوم ہے، خطبہ کے بعد پھر عفو عام کا اعلان فرمایا، علامہ شبلی نے اس واقعہ کو بڑے موثر انداز میں لکھا ہے، اس لیے اسی کو نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے

خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب کے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برساتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ وسنان نے پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہولہان کردیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آکر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹاکر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمتِ عالمؐ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجے میں پوچھا "تم کو معلوم ہے میں تمھارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں، یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بےرحم تھے لیکن مزاج شناس تھے،

پکار اٹھے کہ

اخ کریم ابن اخ کریم — تو شریف بھائی اور شریف برادرزادہ ہے،

ارشاد ہوا

لاتثریب علیکم الیوم اذھبوا — تم پر آج کوئی الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو

انتم الطلقاء (سیرۃ النبی ج اول ص ۳۰۰ و ۳۰۱ تقطیع بڑی)

کیا چشم عالم نے ایسے جانی دشمنوں کے ساتھ عفو و درگذر اور رحم و کرم کا یہ منظر کبھی دیکھا ہو، یہ تھی وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین کی عملی تفسیر،

کفار و مشرکین کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم اور عفو و درگذر کے اتنے واقعات ہیں کہ ان کو نقل کرنا دشوار ہے، نمونۃً صرف چند واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔

مشرکین آپ کو برا بھلا کہتے تھے اور آپ کو محمد (تعریف کیا گیا) کے بجائے مذمم (مذمت کیا گیا) کہتے تھے، آپ لوگوں سے فرماتے تم کو تعجب نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کس طرح پھیر دیتا ہے، وہ مذمم کو گالیاں دیتے اور مذمم پر لعنت بھیجتے ہیں، اور میں محمد ہوں (مشکوٰۃ باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم وصفاتہ بحوالۂ بخاری)

مشہور صحابی حضرت ابوہریرہؓ کی ماں اپنے مذہب پر قائم تھیں، انھوں نے ان کو اسلام کی دعوت میں شریک کرنا چاہا، تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہنے لگیں، حضرت ابوہریرہؓ روتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا، آپ نے ناگواری ظاہر کرنے کے بجائے ان کی ماں کے حق میں دعائے خیر کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود مسلمان ہوگئیں (مسلم کتاب الفضائل باب فضائل ابی ہریرہؓ)

مشہور دشمن اسلام ابوجہل کے لڑکے عکرمہ بھی باپ کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے بڑے

سخت دشمن تھے، اس لیے فتح مکہ کے بعد یمن بھاگ گئے تھے، ان کی بیوی مسلمان ہوچکی تھیں، وہ یمن جاکر ان کو واپس لے آئیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دیکھکر اتنے مسرور ہوئے اور ایسا لپک کر ان کا استقبال کیا کہ شانۂ مبارک سے چادر گر گئی اور آپ نے ان سے اسلام کی بیعت لی (موطا امام مالک باب نکاح المشرک اذا اسلمت زوجتہ قبلہ)

اسی طریقہ سے صفوان بن امیہ بھی اسلام کے بڑے دشمنوں میں تھے[1]، وہ بھی فتح مکہ کے بعد بھاگ گئے تھے، مگر ان کی بیوی نے اسلام قبول کرلیا تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چچیرے بھائی وہب بن عمیر کو صفوان کو لانے کے لیے بھیجا، اور جان بخشی کے نشان کے طور پر اپنی چادر مرحمت فرمائی، وہب یہ چادر دکھا کر ان کو واپس لائے، اور صفوان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر مجمع عام میں پوچھا کہ وہب آپ کی چادر لے کر میرے پاس گئے تھے، ان کا بیان یہ ہے کہ آپ نے مجھ کو بلایا ہے اور مجھے دو مہینے کی مہلت دی ہے، آپ نے فرمایا تم سواری سے تو اترو، انھوں نے کہا جب تک مہلت کی مدت نہ بیان کردیں گے میں نہ اتروں گا، آپ نے فرمایا دو مہینے نہیں بلکہ چار مہینہ کی مہلت ہے، اس کے بعد عرصہ تک صفوان اپنے مذہب پر قائم رہے پھر اسلام قبول کرلیا، (ایضاً ملخصاً)

ہبار بن اسود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا شدید دشمن تھا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضؓ کو جب کہ وہ حمل سے تھیں، اونٹ کے اوپر سے گرادیا، جس سے ان کا حمل ضائع ہوگیا، اور اس کے صدمہ سے ایک عرصہ کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، وہ اشتہاری مجرموں میں تھا، اس لیے فتح مکہ کے بعد ایران بھاگ جانا چاہا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو و درگذر کو دیکھکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور عرض کیا یا رسول اللہ میں ایران بھاگ جانا چاہتا تھا، مگر آپ کے احسانات اور عفو و درگذر پر نظر کرکے حاضر ہوگیا ہوں، مجھے اپنے تمام قصوروں کا اعتراف ہے، ان کو

[1] انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی تھی، تفصیل کے لیے دیکھو زرقانی ج ۳ ص ۲۳۳

معاف کرکے میرا اسلام قبول فرمائیے، آپ نے فرمایا میں نے معاف کیا، یہ خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس نے تم کو اسلام کی توفیق دی، اسلام اپنے پہلے گناہوں کو معاف کردیتا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھو اصابہ ج ۳ ص ۵۹۸)

جنگ احد میں وحشی نامی ایک غلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا حضرت حمزہؓ کو قتل کیا تھا، آپ کو ان کی شہادت کا بڑا شدید قلق ہوا تھا، اس لیے وحشی بھی اشتہاری مجرموں میں تھا، وہ بھی فتح مکہ کے بعد طائف بھاگ گیا تھا، مگر جب طائف بھی فتح ہوگیا اور اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہ رہ گئی تو وہ مجبور ہوکر طائف کے ایک وفد کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور اسلام قبول کرلیا، آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ تم میرے سامنے نہ آیا کرو، تم کو دیکھ کر چچا مرحوم کی یاد آتی ہے، (بخاری کتاب المغازی باب قتل حمزہ و سیرۃ ابن ہشام ج اول ص ۴۵۴)

مشہور منافق عبد اللہ بن ابی، اپنے کو مسلمان ظاہر کرتا تھا، مگر دل میں اسلام اور مسلمانوں کا بڑا دشمن تھا اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا، ایک دفعہ ایک غزوہ میں ایک مہاجر نے ایک انصاری کو پتھر مار دیا، انصاری نے اپنے قبیلہ کی دہائی دی، مہاجر نے بھی مہاجرین کی دہائی دی اور قریب تھا کہ دونوں میں تلواریں چل جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو دونوں کو سمجھا بجھا کر خاموش کردیا اس واقعہ سے عبد اللہ بن ابی کو انصار کو بھڑکانے موقع مل گیا اس نے کہا کہ "مدینہ چل کر ذلیل مسلمانوں کو نکال دوں گا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ سب سے آسان یہ ہے کہ تم لوگ مہاجرین کی خبرگیری سے ہاتھ اٹھا لو وہ خود تباہ ہوجائیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی، تو آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے یہ الفاظ کہے تھے، وہ صاف مکر گیا، حضرت عمرؓ موجود تھے؛ ان کو غصہ آگیا، بولے یا رسول اللہ اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن اڑادوں، فرمایا، جانے دو؛ لوگ چرچا کریں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے تھے، (بخاری کتاب التفسیر باب تفسیر سورہ منافقون)

حسن اخلاق کو دین ابراہیمی میں بڑی اہمیت حاصل تھی، طبرانی کی روایت ہے کہ

اوحی اللہ تعالیٰ الی ابراھیم	اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وحی بھیجی
یا خلیلی حسن خلقک ولو مع الکفا	کہ اپنے اخلاق کو بہتر بناؤ خواہ کفار ہی کے ساتھ
تدخل مداخل الابرار فان	کیوں نہ ہو، ان لوگوں کے بارہ میں جن کا اخلاق
کلمتی سبقت من احسن خلقہ	اچھا ہے، میرا یہ فیصلہ ہے کہ ان کو اپنے عرش
ان اظلہ فی عرشی وان اسکنہ	کے سایہ میں رکھوں گا، ان کو اپنے خطیرۃ القدس
خطیرۃ قدسی وان ادنیہ	میں جگہ دوں گا اور اپنے قریب
من جواری (کنز العمال ج ۳ ص ۳ بحوالہ طبرانی)	ٹھہراؤں گا۔

اس لیے اسلام میں اخلاق کی بڑی اہمیت ہے، اور اس کا مقصد ہی تکمیل اخلاق ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

بعثت لاتمم مکارم الاخلاق	میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں

مکارم اخلاق میں دوسرے اخلاق فاضلہ کے ساتھ حسن اخلاق بھی داخل ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار و مشرکین کے ساتھ بھی حسن سلوک اور حسن اخلاق سے پیش آتے تھے۔ مشرکین کو اپنا مہمان بناتے تھے۔

ابو نضرہ غفاری کا بیان ہے کہ وہ کفر کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہوئے، آپ نے اپنی تمام بکریوں کا دودھ دوہ کر ان کو پلا دیا اور وہ پیٹ بھر کا سویا (مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۳۹۷)

غیر مسلموں کی عیادت فرماتے تھے، ایک مرتبہ ایک یہودی غلام بیمار پڑ گیا، تو آپ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور اس کو اسلام کی تلقین کی، اس نے قبول کر لیا (بخاری کتاب المرضیٰ باب عیادۃ المشرک)

غیر مسلموں کے جنازہ کا احترام کرتے تھے، ایک مرتبہ قادسیہ میں ایک جنازہ گذرا، صحابی رسول حضرت سہل بن حنیف اور قیس بن سعد اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے، لوگوں نے کہا یہ تو ذمی کا جنازہ ہے، انھوں نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے ایک جنازہ گذرا، آپ اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے، لوگوں نے عرض کیا یہ تو یہودی کا جنازہ ہے، فرمایا کیا وہ آدمی نہیں ہے، (نسائی کتاب الجنائز باب القیام لجنازۃ اہل الشرک)

اسلام میں پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہیں، اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہے، اس لیے صحابۂ کرام غیر مسلم پڑوسیوں کا بھی بڑا لحاظ کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے بکری ذبح کرائی تو اپنے غلام کو حکم دیا کہ پہلے میرے یہودی پڑوسی کو گوشت دینا، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا وہ تو یہودی ہے، اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی اس قدر وصیت فرماتے تھے کہ ہم لوگوں کو خوف ہو گیا تھا کہ آپ ان کو وراثت میں شریک کر دیں گے (ادب المفرد باب جار الیہودی)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پڑوسی کے حقوق میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ کا انتقال آپ کے بچپن میں ہو گیا تھا (یعنی حالت شرک میں) حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ نے زمانہ نبوت میں ان کی قبر کی زیارت کی اور آپ پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ جو لوگ پاس تھے وہ بھی رونے لگے، فرمایا میں نے اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی اجازت چاہی مگر نہیں ملی لیکن قبر کی زیارت کی اجازت مل گئی (بخاری کتاب الجنائز باب زیارۃ قبر المشرک)

گو یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ کی قبر کی زیارت کا ہے لیکن اس سے فقہاء نے یہ استنباط کیا ہے کہ مشرکین کی قبر کی زیارت کی جا سکتی ہے،

اہل کتاب مسلمانوں سے زیادہ قریب ہیں، اس لیے قرآن مجید میں ان سے خصوصیت کے ساتھ رواداری کی زیادہ تعلیم ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا	اور اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر شائستہ طریقہ پر
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ	مگر جو لوگ زیادتی کریں (انکا جواب دیا جا سکتا ہے)

ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا
بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ
وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَ
نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (عنکبوت - ۵)

اور ان لوگوں سے کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز
پر جو ہماری طرف اتری (یعنی قرآن مجید) اور
جو تمہاری طرف اتری (یعنی توریت و انجیل) اور
ہمارا تمہارا خدا ایک ہے اور ہم اسکے فرمانبردار ہیں

ان کو حکمت و دانائی اور پند و موعظت کے ذریعہ خدا کے راستے کی طرف بلانا چاہیئے،

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ
الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (نحل - ۱۶)

اور اے پیغمبر اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت کی
باتوں اور اچھے طریقہ پر پند و موعظت کے ذریعہ بلاؤ
اور عمدہ طریقہ پر ان سے بحث و مباحثہ کرو۔

یہود تو مسلمانوں کے کھلے ہوئے دشمن تھے، لیکن عیسائیوں کو شروع میں مسلمانوں سے عناد نہ تھا، اور ان میں یہودیوں کے مقابلہ میں رقت قلب، اثر پذیری اور قبول حق کی صلاحیت تھی، اس لیے کلام مجید نے ان کی تعریف کی ہے۔

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً
لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ
أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ
مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ
قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ
مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ
لَا يَسْتَكْبِرُونَ وَإِذَا سَمِعُوا مَا
أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ

اے پیغمبر، مسلمانوں کے ساتھ دشمنی میں یہود اور
مشرکین کو زیادہ سخت پاؤگے، اور مسلمانوں کے
ساتھ دوستی میں سب لوگوں میں ان کو زیادہ
قریب پاؤگے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں (ان کا
یہ میلان) اس سبب سے ہے کہ ان میں علماء و مشائخ
ہیں اور یہ لوگ تکبر نہیں کرتے، اور جب قرآن
سنتے ہیں جو رسول پر نازل کیا گیا ہے تو دیکھوگے
کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں

تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ
الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا
مَعَ الشَّاهِدِينَ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ
بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ
أَنْ يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ
الصَّالِحِينَ (مائدہ - ۱۱)

اس لیے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا ہے اور یہ لوگ
دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے
اسلیے تو ہم کو (دین حق) کی تصدیق کرنے والوں
میں لکھ لے اور ہم کو کیا ہوگیا ہے کہ ہم اللہ پر اور جو
حق بات ہمارے پاس آئی ہے اس پر ایمان نہ لائیں
اور توقع رکھیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک بندوں کے ساتھ

اہل کتاب کا کھانا اور ان کے ساتھ کھانا پینا اور ان کی عورتوں سے شادی کرنا حلال اور جائز ہے،

الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ
وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ
حِلٌّ لَكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَهُمْ
وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ
مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ
إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ
مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ
وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ
حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ
مِنَ الْخَاسِرِينَ (مائدہ - ۱۲)

مسلمانو! آج تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے
حلال کردی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے
لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے،
اور مسلمان بیاہتا بیبیاں اور جن لوگوں کو
تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے ان کی بھی بیاہتا
عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں، بشرطیکہ ان کی
مہر ادا کرو اور تمہارا ارادہ ان کو نکاح میں
لانے کا ہو نہ کھلم کھلا بدکاری کرنیکا اور نہ
چوری چھپے آشنائی کرنے کا اور جو ایمان کی باتوں
کو نہ مانے ان کے اعمال اکارت ہیں اور وہ
آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔

لیکن اس سے مراد وہی اہل کتاب ہیں جو اپنے مذہب پر قائم اور اس کے حلال و حرام کے پابند ہیں،

عیسائیوں کو اپنا مہمان بناتے تھے اور خود ان کی خدمت انجام دیتے تھے،

ایک مرتبہ حبشہ کے عیسائی بادشاہ نجاشی کے یہاں سے ایک سفارت آئی، آپ نے اس کو اپنا مہمان بنایا اور بنفس نفیس مہمانداری کے تمام مراسم انجام دیے، صحابہ نے عرض کیا ہم یہ خدمت انجام دیں گے، ارشاد ہوا ان لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت کی ہے، اس لیے میں خود ان کی خدمت کروں گا،

(شرح شفا، قاضی عیاض، خفاجی ج ۲ ص ۱۰۰)

ان کو اپنی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت تک دیتے تھے، چنانچہ نجران کے عیسائیوں کا وفد جب مدینہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسجد میں حاضر ہوا، اس وقت عیسائیوں کی نماز کا وقت آگیا تھا، اس لیے انھوں نے مسجد ہی میں نماز شروع کردی، مسلمانوں نے روکنا چاہا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع کردیا، اور فرمایا نماز پڑھنے دو، چنانچہ انھوں نے مسجد نبوی میں مشرق کی جانب رخ کرکے نماز پڑھی (زاد المعاد ج اول ص ۳۵)

ایک مدت تک آپ کا یہ معمول تھا کہ جن چیزوں کے بارہ میں قرآن میں کوئی حکم نہیں نازل ہوتا تھا، ان میں آپ یہود کی تقلید فرماتے تھے (بخاری) لیکن پھر یہود نے اپنے نفرت انگیز طرز عمل سے خود دوری پیدا کردی اور قرآنی احکام کے نزول کے بعد اس کی ضرورت بھی باقی نہ رہی،

(باقی)

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حصہ اول :-	قیمت :-	لعہ	حصہ چہارم :-	قیمت	عہ
حصہ دوم :-	”	ہے	حصہ پنجم :-	”	معہ
حصہ سوم :-		عہ	حصہ ششم :-	”	عہ

پورے سٹ کے خریدار کو ۱۰ فیصدی کمیشن یعنی رعایتی قیمت ۵۶ روپے ہوگی۔

منیجر

شیخ احمد سرہندی

(مجدد الف ثانی)

از جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب حیدرآباد سندھ

(۸)

سانحۂ ارتحال وفات سے دس برس قبل ۱۰۲۴ھ میں شیخ مجددؒ نے فرمایا تھا:۔

"چناں وانمودند و الہام گردانیدند کہ قضاے مبرم و عمر زندگانی تا بشصت و سہ سالگی ست"[۱]

پھر ۱۰۳۲ھ میں جب آپ کا قیام لشکر شاہی کے ساتھ اجمیر شریف میں تھا، ایک دن فرمایا "ہمارے انتقال کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں"۔ اور صاحبزادگانِ گرامی قدر خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو سرہند تحریر فرمایا:۔

" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم کو دنیا کا اجازت نامہ دینے کے بجائے آخرت کا اجازت نامہ دیا گیا"۔[۲]

اس مکتوب کے پہنچتے ہی دونوں صاحبزادے خدمت بابرکت میں اجمیر شریف حاضر ہوئے، شیخ مجددؒ نے چند روز ان کو خلوت میں رکھا، پھر فرمایا:۔

"مرا کنوں بہ ہیچ گونہ نظرے و بہ ہیچ وجہ بستگی بہ ایں جہاں نماندہ۔ می باید بہ آں جہاں شد و آثار رفتن نیز مشہود می گردد"[۳]

۱؎ خواجہ محمد ہاشم کشمی: زبدۃ المقامات مطبوعہ کانپور ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء ص ۲۸۲ ۲؎ خواجہ بدرالدین: حضرات القدس، مطبوعہ لاہور ۱۳۴۱ھ ص ۱۷۷

۳؎ زبدۃ المقامات ص ۲۸۲

یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ انھیں دنوں حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ (م ۶۳۳ھ / ۱۲۳۶ء) کی درگاہ میں آپ مراقب تھے، اسی دن مزار مبارک کی چادر بدلی گئی، جب شیخ مجددؒ مراقبہ سے فارغ ہوئے تو درگاہ کے خادموں نے وہ چادر آپ کی نذر کی، آپ نے آہ سرد کھینچی اور فرمایا:-

"لباسے ازیں نزدیک تر بحضرت خواجہ نبود لاجرم آں را بما لطف نمودند، برائے کفن ما نگاہ داشتہ باشی"[1]

خواجہ محمد ہاشم کشمی فرماتے ہیں کہ اجمیر شریف کے زمانہ قیام میں ایک رات حجرۂ شریف کے قریب گیا تو اندر سے گریہ وزاری کی آواز آرہی تھی، کان لگا کر سنا تو آپ زار و قطار رو رہے ہیں اور یہ شعر زبان مبارک پر جاری تھا ؎

بادو روزہ زندگانی جائے نہ شد سیر از غمت
وہ چہ خوش بودے کہ عمر جاودانی داشتے

اللہ اللہ! غم محبوب کی طلب تو دیکھو کہ عمر جاودانی کی آرزو بھی کی تو غم جاناں کے لیے!

۱۰۳۲-۳ء میں شیخ مجدد جہانگیر (م ۱۰۳۷ھ / ۱۶۲۷ء) سے اجازت لے کر واپس سرہند تشریف لائے اور یہاں آکر خلوت گزیں ہو گئے، خلوت خاص میں صرف مخدوم زادگان، خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ اور دو تین خادموں کو باریابی ہوتی تھی، صوبہ دکن میں کچھ اختلال ہوا تو خواجہ محمد ہاشم کشمی نے اپنے گھر واپس جانے کے لیے اجازت طلب کی اور دعا کی درخواست کی، شیخ مجددؒ نے آہ سرد بھر کر فرمایا:-

"دعا کنم کہ در آخرت باہم یک جا جمع شویم"[2]

اس کے بعد خواجہ محمد ہاشم کشمی اواخر رجب ۱۰۳۲ھ میں رخصت ہو گئے۔ رباعی

خوش نشگفتہ از دبستاں رفتیم   صبحے نشگفتہ از گلستاں رفتیم
آوخ کہ چوں آہ سرد اصحاب خمار   ناخوردہ شراب از دل مستاں رفتیم

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۲۰۴، [2] ایضاً ص ۲۰۵

اس کے بعد کے حالات خواجہ بدرالدین سرہندیؒ سے معلوم ہوتے ہیں جو شیخ مجددؒ کے خلفاء میں ہیں اور ایک زمانہ تک آپ کی صحبت میں رہے ہیں، خواجہ موصوف فرماتے ہیں کہ ماہ شعبان ۱۰۳۳ھ کی پندرھویں شب کو شیخ مجددؒ آدھی رات کے وقت مکان کے اندر تشریف لائے، اہلیہ محترمہ مصلے پر تشریف فرما تھیں، انھوں نے فرمایا:-

"امشب کہ شب تقدیر آجال و آمال است خدا داند نام کرا از ورق ہستی محو کردہ باشند و نام کرا ثبت داشتہ"[1]

شیخ مجددؒ نے یہ سنکر فرمایا:-

"شما بشک و تردد می گوئید چہ باشد حال آں کس کہ معائنہ می بیند کہ نام او را از صحیفۂ زندگانی ایں جہانے محو ساختند"[2]

وسط ذی الحجہ ۱۰۳۳ھ میں ضیق النفس کا عارضہ شدت اختیار کر گیا، جس قدر مرض شدت اختیار کرتا جاتا، شوق لقائے محبوب بھی بڑھتا جاتا تھا اور اللھم بالرفیق الاعلیٰ زبان مبارک پر جاری تھا، شوق وصال میں ایک دن فرمایا:-

"اگر حکیم یہ کہے کہ تیرا مرض قابل علاج نہیں ہے تو خدا کا شکر ادا کروں گا"[3]

اور شدت اشتیاق میں زبان گہربار پر یہ مصرع جاری تھا۔ ع

آج ملاوا کنت سوں سکھی سبھ جگ دینو وار

۱۲ محرم الحرام ۱۰۳۴ھ کو فرمایا:

"مجھے بتایا گیا ہے کہ چالیس پچاس دن کے اندر اندر تو اس جہان سے رخصت ہو جائیگا" (زبدۃ المقامات)

چالیس روز گذرنے کے بعد ۲۲ صفر المظفر ۱۰۳۴ھ کو فرمایا:-

"چالیس روز تو گزر گئے ہیں دیکھو سات آٹھ روز میں کیا پیش آتا ہے" (زبدۃ المقامات)

[1، 2] زبدۃ المقامات ص ۲۰۵-۲۰۶ و حضرات القدس ص ۱۱۷، [3] ایضاً ص ۲۸۶

۲۳ر صفر المظفر جمعرات کے دن فقراء میں کپڑے تقسیم کیے، تنفس کی شکایت کے ساتھ بخار بھی ہوگیا، ۲۴ر صفر کی رات کو تہجد کے وقت بیدار ہوئے، بخار کی حالت میں کھڑے ہوکر نماز تہجد ادا کی اور فرمایا :-

"ایں آخریں تہجد است[1]"

اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا عظیم الشان جذبہ تھا، آخری وقت صاحبزادگان کو وصیت فرمائی : سنت را بدنداں خواہند گرفت[2]"

پھر اپنی قبر کے لیے وصیت فرمائی : "قبر مرا در جائے گمنام خواہند مقرر داشت[3]"

صاحب زادگان کو کچھ تامل ہوا تو فرمایا :

"اگر چنیں نکنید بیرون شہر نزدیک والد بزرگوار دفن کنید یا بیرون شہر در باغ تربت من مقرر دارید و قبر مرا خام گذارید تا باندک زمانے ازاں نشانے نماند[4]"

سبحان اللہ! فنا کے کس درجہ پر تھے کہ نشان قبر تک گوارا نہیں، مگر جو اس بے نشان کے عشق میں مبتلا ہیں ان کا نام ونشان مٹانا گردش دوراں کے بس میں نہیں ع

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

۲۸ر صفر المظفر دوشنبہ کے دن جس دن آپ کا وصال ہوا، رات کو خادموں کو بلاکر فرمایا "بسیار محنت کشیدید ہمیں امشب است وبس[5]" بہت تکلیف اٹھائی، بس آج کی رات اور باقی ہے

۲۹ر صفر المظفر ۱۰۳۴ھ دوشنبہ کے روز آپ کی حالت زیادہ نازک ہوگئی تو خواجہ محمد سعید (م ۱۰۷۰ھ / ۱۶۶۰ء) نے عرض کیا :-

---

۱؎ زبدۃ المقامات ص ۲۸۹ ۲؎ تا ۴؎ ایضاً ص ۲۹۰-۲۸۹ ۵؎ ایضاً ص ۲۹۲

"حال شریف چون ست ؟" (زبدۃ المقامات)

جواباً ارشاد فرمایا :- "خوبیم، آں دو رکعت نماز کردہ ایم کافی است[1]"

اس کے بعد آپ نے کلام نہیں فرمایا اور ذکر ذات شروع کر دیا اور تھوڑی دیر کے بعد جان عزیز جان جاناں کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بہر بہار گُل ازگل بر آرد سر

گلے برفت کہ نآید بصد بہار دگر

کیفیت غسل | شیخ مجددؒ کی کیفیت غسل بھی قابل ذکر ہے، کما تعیشون تموتون خواجہ بدر الدین علیہ الرحمہ غسل کے وقت موجود تھے، وہ پانی دے رہے تھے اور شیخ مجددؒ کے بھتیجے شیخ بہاء الدین غسل دے رہے تھے، شیخ بدر الدین کا بیان ہے کہ خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ نے اس طرح نقل کیا ہے :-

"چوں غسال آں بدن انور را بتختۂ غسل آورد و جامہا را از تن مبارک برکشید. ہمہ حاضراں معائنہ دیدند کہ آں حضرت بر شیوۂ نماز دست بستہ بودند و ابہام و خنصر دست راست بگرد رسغ دست چپ حلقہ دادہ و حال آں کہ حضرات مخدوم زادہا بعد ارتحال دست ہائے ایشاں را دراز کردہ بودند در زمان خوابانیدن بر تختہ تبسم نمودند و مدتے ہم چناں تبسم بودند چناں کہ فریاد از حاضراں برآمد۔ ایں قصہ مصداق ایں قطعہ گردید :-

یاد داری کہ وقت آمدنت | ہمہ خنداں بدند تو گریاں

ہم چناں زی کہ وقت رفتن تو | ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

۱؎ زبدۃ المقامات ص ۲۹۲

دست ہاے شریف را غسال کشادہ راست کردہ بر پہلو مضطجع گردانیدہ غسال جانب یمین داد چون بر جانب یمین خوابانید تا پہلو ہا نیز غسل دادہ باز مرئی حاضراں گردید کہ دست ہاے شریف بحرکت ضعیف کہ آں از قوت ولایت کامل نشان قوی بود متحرک شد تا ہم آمدہ و بطریق سابق ابہام و خنصر یمین بر رسغ یسار حلقہ گشت و حال آں کہ چوں اضطجاع بر یمین یافتہ کہ دست راست بر چپ نمی ایستاد باوجود آں کہ دست ہاے لطیف از غایت نرمی از موم و برگ گل ملائم تر بود لیکن بقوتے مقبوض شدہ بودہ کہ افتادن و جدا شدن امکان نداشتہ۔ وقتے کہ کفن پوشانیدہ اند آں وقت نیز آں قبض بنحو رسیدہ بود و ہم چنیں از آں کہ حضرت را بر تختہ غسل فرود آوردند قبض بدیں بنج مسطور واقع گردید۔ و چوں حاضراں کشادند مشاہدہ می کردند کہ دست ہاے مبارک آں حضرت بسبیل مذکور باہم جمع شدند و ہم بریں منوال دو سہ کرت واقع شد آخر چوں معلوم گردید کہ ایں جا سرے ست مبطن و رازے ست مخفی باز کشادن آں متعرض نہ شدند گفتند حضرت خواجہ محمد سعید سلمہ اللہ فرمودہ اند کہ چوں مرضی حضرت ایشان ہا سکنہ اللہ بحبۃ الجنان چنیں ست چنیں گزارید۔ صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما تعیشون تموتون۔
ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔ الخ[1]

یعنی جب غسال نے بدن انور کو تختہ پر لٹایا اور کپڑے اتارے تو حاضرین نے ملاحظہ کیا کہ حضرت نیت باندھے ہوئے ہیں، حال آں کہ انتقال کے وقت مخدوم زادگان نے ہاتھ سیدھے کر دیے تھے، جب ہاتھوں کو کھول کر بائیں کروٹ پر لٹایا اور داہنی طرف غسل دیا اور پھر داہنی کروٹ پہ لٹا کر بائیں طرف غسل دے کر سیدھا لٹایا تو پھر حاضرین نے دیکھا کہ ہاتھوں کو حرکت ہوئی اور وہ

[1] زبدۃ المقامات ص ۲۹۳

خود بخود نیت کی حالت میں آ گئے، ہاتھ لگا کر دیکھا گیا تو گرفت مضبوط تھی، حالانکہ آپ کے دست مبارک پھول کی پنکھڑی کی طرح ملائم تھے، جب ہاتھ علیحدہ کیے گئے تو پھر حاضرین نے دیکھا کہ اسی طرح ہو گئے دو تین مرتبہ ایسا ہوا، آخر خواجہ محمد سعیدؒ نے فرمایا کہ جب حضرت کی یہی مرضی ہے تو رہنے دو۔

اقبال نے خوب کہا ہے:۔

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

غالباً شیخ مجددؒ کے اسی اعجاز کو سن کر آپ کے مخدوم زادے حضرت خواجہ محمد عبد اللہ (م۔ ۱۰۷۵ھ) نے سانحۂ ارتحال کا یہ تاریخی مادہ نکالا ہے:۔

مَاتَ وَلَمْ یَمُتْ بَلْ حَیٌّ اَبَدًا
۱۰۳۴ھ

خواجہ محمد باقی باللہ (م۔ ۱۰۱۲ھ) کے خلیفہ مولانا محمد صادق نے یہ مادۂ تاریخ نکالا ہے

الموت ھو جسر یوصل الحبیب الی الحبیب[1]
۱۰۳۴ھ

خواجہ محمد ہاشم کشمی نے اس آیت سے تاریخ وفات نکالی ہے:۔

اِلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ[2]
۱۰۳۴ھ

اس کے علاوہ انھوں نے یہ قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے:۔

یا ایہا الانام لقد سافر الامام من کان ذیل رافتہ عروۃ القبول

[1] زبدۃ المقامات ص ۳۰۰ [2] ایضاً

قطب الذی تفوض رب السمائه — عال التی تحیر فی شانها العقول

بالموت کان بدر کمال قد انطلق — من مشرق الظهور الی مغرب الافول

لما اصاب ارث رسول بحقه — اکتب لعام رحلته وارث الرسول[1]

۱۰۳۴ھ

مقام شیخ مجددؒ

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے

وہ فقر جس میں بے پردہ ہو روح قرآنی

تاریخ ہند کے تاریک ترین دور میں شیخ مجددؒ نے جو اصلاحی کارہائے نمایاں انجام دیے وہ ان کی عظمت پر شاہد ہیں، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی نے شیخ مجددؒ کو "مجدد الف ثانی" کے لقب سے پکارا،[2] اور ملت اسلامیہ نے یک زبان ہو کر اس کی تائید کی، چنانچہ آج ان کی شہرت اسی لقب سے ہے۔

خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ فرماتے ہیں:-

"راقم حروف گوید مرا بر دل خطور می کرد اگر یکے از اعاظم علمائے وقت ایں معنی را کہ حق سبحانہ ایشاں را "مجدد الف" ساختہ مسلم می داشت تائید تمام بود تا روزے بایں خطرہ بخدمت حضرت ایشاں رسیدم۔ بہ ایں حقیر خطاب نمودہ فرمودند:-

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کہ در علوم عقلیہ و نقلیہ و تصانیف علیہ چوں وے در دیار ہند نمی نماید کتابتے بما نوشتہ بود تبسم نمودہ فرمودند یکے از آں فقرات مدحیہ ایں بود کہ "مجدد الف ثانی"[3]

[1] زبدۃ المقامات ص ۳۰۰ [2] وکیل احمد سکندر پوری: ہدیۂ مجددیہ، مطبوعہ دہلی ۱۳۰۹ھ ص ۹۸ [3] ایضاً

یہ بات خود ساختہ ہے کہ خود شیخ مجددؒ نے دعوی مجددیت کیا تھا، انھوں نے کسی مکتوب میں بھی اپنے کو مجدد نہیں لکھا، بلکہ ہمعصر اور متاخرین علماء و صوفیہ نے آپ کو "مجدد الف ثانی" لکھا ہے، شاہ غلام علیؒ (م ۱۲۴۰ھ) فرماتے ہیں:-

"ایشاں "مجدد الف ثانی" اند۔ و حقائق و دقائق و کثرت معارف الٰہیہ و فیوض و برکات ایشاں و افاضات کثیرہ کہ اصلاح دلہا نمودہ و مقامات عالیہ کہ در طریقۂ خود با لہامات حقہ مقرر فرمودہ اند و آں مقامات قرب الٰہی است سبحانہ"[1]

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، شیخ مجددؒ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

"...... و چوں ہزار گذشت و نوبت الوالعزم رسید حق تعالیٰ موافق عادت قدیم برائے ہزارۂ دوم مجددے پیدا کرد کہ در سائر اولیاء مجدد ان مثل اولوالعزم باشد در انبیاء و رسولان وا و را از بقیہ طینت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آفرید و ایں مقامات و کمالات داد کہ کسے ندیدہ بود و بطفیل او ایں کمالات در آخر زماں شائع و جلوہ گر گردانید"[2]

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (م ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) اور شیخ مجددؒ کے درمیان متصوفانہ مسائل پر کچھ تکدر پیدا ہو گیا تھا، لیکن جب ۱۰۳۰ھ میں شیخ عبدالحقؒ نے اپنے صاحبزادے شیخ نور الحق (م ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء) کو بھیج کر خط و کتابت کے ذریعہ صفائی کر لی تو اسی زمانہ میں شیخ عبدالحق نے خواجہ محمد باقی باللہ (م ۱۰۱۲ھ) کے خلیفہ خواجہ حسام الدینؒ (م ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء) کے نام ایک مکتوب لکھا تھا، اس میں شیخ مجددؒ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

"دریں ایام صفائے فقیر بخدمت میاں — ان دنوں میاں شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ

[1] شاہ غلام علیؒ: مکاتیب شریفہ، مطبوعہ لاہور ۱۳۷۱ھ ص ۵ مکتوب اول۔

[2] قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی: ارشاد الطالبین، مطبوعہ لاہور ۱۳۷۱ھ ص ۹۳۔

شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ از حد متجاوز است واصلاً پردهٔ بشریت و غشاوهٔ جبلت بمیان نماندہ قطع نظر از رعایت طریقہ والصاف و حکم عقل کہ با این چنین عزیزان و بزرگان می باید بود در باطن بطریقہ ذوق و وجدان و غلبہ چیزے افتادہ کہ زبان از تقریر آں لال است، سبحان اللہ مقلب القلوب و مبدل الاحوال شاید ظاہر بیان استبعاد کنند. من نمی دانم کہ حال چیست و بہ چہ منوال است؟[۱]

سے فقر کی صفائی حد سے زیادہ ہو چکی ہے، اور پردهٔ بشریت و جبلت درمیان میں نہیں رہا۔ انصاف و عقل اور رعایت طریقہ سے قطع نظر (کہ جو اس قسم کے عزیزوں اور بزرگوں کے ساتھ برتاؤ ہونا چاہیے) باطن میں ذوق و وجدان اور غلبہ سے وہ چیز آئی ہے کہ زبان اس کے بیان سے قاصر ہے، کیا ہی پاک ہے وہ ذات جو دلوں کو پھیر دیتی ہے اور حالوں کو بدل دیتی ہے، شاید ظاہر میں استبعاد سے کام لیں، میں نہیں جانتا کہ حال کیا ہے اور کس طرح ہے؟

مولانا محمد حسن غوثی علیہ الرحمہ نے جو شاہ محمد غوث گوالیاریؒ (م ۹۷۰ھ) کے مرید تھے، اولیاے کرام کے حالات میں ایک تذکرہ مرتب کیا تھا، موصوف شیخ مجددؒ کو ان القاب سے یاد فرماتے ہیں:-

بالانشین مسند محبوبیت، و صدر آرائے محفل وحدانیت خدیو مقام فردیت، و صاحب مرتبہ قطبیت الخ[۲]

جس زمانے میں شیخ مجددؒ لشکر شاہی کے ساتھ اجمیر شریف میں مقیم تھے، بلخ سے ایک طالب زیارت کے لیے آیا، اور ذیل کے بزرگوں کے نیازمندانہ دعوت نامے پیش کیے، سید میر، شیخ قدیم کبروی، میر مومن، مولانائے ربانی حسن قبادیانی، اقضی القضات مولانائے تولک وغیرہم۔ طالب مذکور نے شیخ مجددؒ کی خدمت بابرکت میں میر مومن بلخی کا یہ زبانی پیغام بھی پہنچایا:

[۱] شیخ عبدالحق: اخبار الاخیار، مطبع دہلی، ۱۳۳۲ھ، ص ۳۲۶ (ضمیمہ)

[۲] خواجہ محمد ہاشم کشمی: زبدۃ المقامات، ص ۲۱۸

"اگر ما را کبر سن و مسافت بعیدہ مانع نبودے بملازمت شریف رسیدہ بقیہ عمر در خدمت می بودیم۔ و از انوار احوال بلند" مالا عین رأت ولا اذن سمعت" اقتباس می نمودیم۔ چون این موانع درمیان است التماس آن ست از مخلصان حضور دانستہ با فاضات غائبانہ متوجہ احوال این محبان بظاہر مہجور بمعنی در خدمت حضور می بودہ باشند"[۱]

شیخ مجددؒ کی حیات ہی میں ان کی شہرت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ممالک میں بھی پھیل چکی تھی، مولانا رحمان علی لکھتے ہیں:-

"و بہ ہمان زمان آوازهٔ آں حضرت بلند شدہ آستان محط رجال و مجمع اصحاب کمال گشت۔ علماے دور و نزدیک و امرائے ترک و تاجیک بہ شرف حضور بہرہ ور گردیدند و مشائخ ارادت آوردند و سلسلہ شان از ہند تا ماوراء النہر و روم۔ شام و مغرب رسیدہ"[۲]

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں:-

"سحاب ہاطل، روی العرب و العجم امطارہ، نیراعظم، بلغ المشارق و المغارب انوارہ۔ جامع العلوم الظاہرہ والباطنہ، خازن الکنوز البارزہ و الکامنہ"[۳]

یہ بیانات اس کے شاہد ہیں کہ شیخ مجددؒ کا آوازہ ہند اور بیرون ہند میں خود ان کی زندگی میں بلند ہو چکا تھا،

شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء) نے شیخ مجددؒ کے رسالہ "رد الرفضہ" کی عربی میں شرح لکھی ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں:-

الرسالة التی انشاها اوحد زمانه وفرید آوانه الجهبذ

یہ رسالہ ایسے یکتائے زمانہ، فرید وقت اور کامل الفن نے تصنیف کیا ہے، جو

[۱] زبدۃ المقامات ص ۲۹۰ [۲] تذکرہ علمائے ہند مؤلفہ مولانا رحمان علی مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۴ء ص ۱۱ [۳] سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان مطبوعہ ۱۳۰۳ھ ص ۴۸

الراسخ فی الشریعة والطریقة
والطود الشامخ فی المعرفة
والحقیقة، ناصر السنة
قامع البدعة، سراج الله
الموضوع لیستضیء به من شاء
من عباده المؤمنین، وسیف
الله المسلول علی اعدائه من
الکفرة والمبتدعین، الامام
العارف العالم الالمعی مولانا
الشیخ احمد الفاروقی الماتریدی
الحنفی النقشبندی السرهندی الخ[1]

شریعت وطریقت پر ثابت قدم ہے، معرفت
حقیقت میں ایک بلند پہاڑ کی مانند ہے، ناصر
سنت اور قامع بدعت ہے، خدا کا روشن
چراغ ہے، اس کے مومن بندوں میں سے
جو چاہتا ہے اس سے روشنی حاصل کرتا ہے، دشمنان
خدا کفار اور بدعتیوں کے لیے وہ اللہ کی
ننگی تلوار ہے، امام عارف ہے، روشن
دماغ عالم ہے، جس کا نام مولانا
شیخ احمد فاروقی ماتریدی
حنفی نقشبندی سرہندی ہے،

شاہ غلام علیؒ (م۔ ۱۲۴۰ھ) "ایضاح الطریقہ" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

.... وباوجود اخذ وکسب فیوض ہر چہار
خاندان عالی شان از جناب الٰہی بمواہب
جلیلہ وعطایائے نبیلہ سرفراز شدہ
اند کہ عقل در ادراک آں کمالات و
حالات حیران است حضرت خواجہ
رضی اللہ تعالیٰ عنہ دربارۂ حضرت ایشان

چاروں عالی شان سلسلہ ہائے طریقت سے
اخذ اور کسب فیوض کے علاوہ اللہ کی
درگاہ سے مواہب جلیلہ اور عطایائے
نبیلہ سے سرفراز ہوئے ہیں، ان کے کمالات
وحالات کے سمجھنے میں عقل متحیر وعاجز ہے، حضرت
خواجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ

۱؎ محمد منظور نعمانی: تذکرہ مجدد الف ثانی، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۹ء ص ۳۰۲

فرمودہ اند کہ مثل ایشان زیر فلک نیست
و دریں امت مثل ایشان چند کس معلوم
می شود و معلومات و مکشوفات ایشان
ہمہ صحیح و قابل آن است کہ بنظر انبیاء
علیہم الصلوات والتسلیمات درآید و
از مکاتیب شریفہ حضرت خواجہ قدس
اللہ سرہ العزیز کمال حضرت ایشان
معلوم می شود[1]

آسمان دنیا کے نیچے ان جیسا کوئی نہیں ہے
اور امت مسلمہ میں ان جیسے چند ہی لوگ گزرے
ہیں، آپ کی معلومات اور مکشوفات صحیح ہیں،
اور اس قابل ہیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰت
والتسلیمات کی نظر میں لائی جائیں، حضرت
خواجہ قدس اللہ سرہ العزیز کے
مکاتیب شریفہ سے آپ کے کمال کا
علم ہوتا ہے،

نواب صدیق حسن خاں مشرباً اہل حدیث تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے شیخ مجددؒ کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے:۔

.... عالم، عارف کامل مکمل بود، طریقۂ نقشبندیہ را امام عہد است و برائے صوفیہ و سالک سلوک مجدد، مکتوباتش در سہ مجلد ہست ودلیل واضح اند بر علو علم وکمال تبحر و معرفت وبلوغ غایت مقامات ...... وطریقۂ علیہ وے رحمہ اللہ مبنی بر اتباع کتاب وسنت در ظاہر و باطن و نہ پذیرفتن چیزے کہ مخالف ایں ہر دو اصل محکم باشد و دریں مکتوبات اصول عظیمہ است از برائے وصول بمنازل معرفت وقبول طالب صادق و سالک راغب را در ہیچ وقت از اوقات از مطالعہ آں بے نیازی حاصل نیست"[2]

ایک اور جگہ شیخ مجددؒ کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:۔

علو مرتبہ کشفہائے مجدد الف ثانی دریافت باید کرد کہ از خیمۂ صحو سرزدہ وگاہے مخالف شرع

۱؎ شاہ غلام علی دہلوی: ایضاح الطریقہ مطبوعہ دہلی ۱۳۷۶ھ ص ۵۶ ۲؎ نواب صدیق حسن خاں: تقصار جیود الاحرار (ص ۱۱۱-۱۱۲) بحوالہ تذکرہ مجدد الف ثانی مرتبہ محمد منظور نعمانی۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۹ء ص ۳۰۷۔

نیفتادہ بلکہ جنبیز را شرع مؤید است و بعضے چنان است کہ شرع از ان ساکت است و مرتبہ او در اولیاء مثل مرتبہ اولو العزم است در انبیاء"[1]

مولانا ابو الکلام آزاد (م ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۸ء) نے شیخ مجدد کے حضور میں جن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے، راقم اپنے دل میں اس کی آواز بازگشت محسوس کر رہا ہے اس لیے اپنے دلی جذبات، واردات اور کیفیات کو انہی کے الفاظ میں نقل کرتا ہے:-

"سیرت مجدد دیکھتے ہوئے کچھ عجب انشراح خاطر اور انبساط طبع بہم پہنچا جس کی کیفیت حد بیان سے باہر ہے اور یقیناً اس ارادت و نسبت کا نتیجہ ہے جو حضرت ممدوح سے اس عاجز اور اس عاجز کے خاندان کے تمام اکابر کو نسلاً بعد نسلٍ قائم رہا ہے۔

وما ذاک الا ان ہذہ اعشیۃ   تمشت وجرت فی جوانبہ بردا

حتی کہ اس کو اپنے خمیر طینت میں ممزوج پاتا ہوں اور اس وقت سے بر سر نفوذ و ظہور دیکھتا ہوں۔

قبل ان اعرف الہوی   فصادف قلبا خالیا فتمکنا

یہی نسبت اور ارادت کی ایک دولت ہے جو شاید ہم بے مایگان کار اور تہی دستان راہ کے لیے توشۂ آخرت اور وسیلۂ نجات ثابت ہو، اگر اس کے دامن تک ہاتھ نہ پہنچ سکا تو اس کے دوستوں کا دامن تو پکڑ سکتے ہیں، اللہ اس راہ میں ثبات و استقامت ورزی عطا فرمائے اور اس کے دوستوں کی محبت و ارادت سے ہمارے قلوب ہمیشہ معمور و آباد رہیں۔"[2]

اللھم انی اسئلک حبک وحب من یحبک وحب عمل یقربنی الیک۔ آمین!

عطا اسلاف کا جذب دروں کر
شریک زمرۂ لا یحزنون کر

---

[1] نواب صدیق حسن خان: ریاض المرتاض، ص ۲۲-۱۳۱ بحوالہ مذکور [2] ابو الکلام آزاد: تذکرہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۵-۶ (حاشیہ)

علمائے اسلام کے القاب کی تاریخ

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

دینی علوم اور اسلامی تعلیمات ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے ضروری ہیں، البتہ ان میں تبحر و انہماک خاص خاص لوگوں کا حصہ ہے، اور جو حضرات یہ حصہ پاتے ہیں ان کو علمائے اسلام اور علمائے دین کہا جاتا ہے، اور ان کے لیے منصب و حیثیت کے اعتبار سے خاص خاص القاب ہوتے ہیں، جن کو ان کے ناموں کے ساتھ استعمال کر کے تعظیم و تکریم ظاہر کی جاتی ہے،

اسلام میں علماء کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو ہندو مذہب اور عیسائیت میں برہمنوں اور پادریوں کو حاصل ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے گویا سیاہ و سفید کے مالک ہوتے ہیں اور عوام مذہبی زندگی میں ان کے ہاتھ میں مجبور ہوتے ہیں، البتہ علمائے دین کی تعظیم و تکریم اور اچھے القاب و خطابات سے ان کو یاد کرنا اخلاقی فرض ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اہل علم و فضل کے لیے القاب بہت زیادہ ملتے ہیں، اس مقالہ میں ہم ان القاب کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوگا کہ علمائے دین کے لیے آج جو القاب و خطابات استعمال ہوتے رہے ہیں ان میں کیا روح کارفرما تھی اور اب وہ کس طرح پامال ہو رہے ہیں،

عالم | عالم کا لقب صدر اسلام سے لیکر آج تک دینی علوم و فنون کے حاملین اور ان کے پڑھنے پڑھانے والوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، قرآن حکیم میں یہ لقب علمائے دین کے حق میں آیا ہے چنانچہ إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ اور أَن يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَائِيلَ میں علماء سے مراد دین کے

عالم ہیں، احادیث میں بھی یہ لقب اسی طبقہ پر بولا گیا ہے، جیسا کہ فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم وغیرہ میں ہے، اور جب "عالم" کو متعلم کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے تو اس سے مدرس و معلم بھی مراد ہوتا ہے، جیسا کہ اس حدیث میں ہے اغدُ عالماً او متعلماً۔

ابتدا میں عالم کا اطلاق کسی خاص علم و فن یا کسی خاص مقام کی طرف اضافت کی شکل میں ہوتا تھا، جیسے عالم المدینہ، عالم خراسان، عالم الکوفہ، عالم اہل المدینہ، عالم اہل خراسان، عالم اہل الکوفہ، اور عالم المغازی والسیر، عالم الناسخ والمنسوخ اور عالم الحدیث والآثار وغیرہ، مگر بعد میں بغیر اضافت کے استعمال ہونے لگا،

علامہ علامہ مبالغہ کا صیغہ ہے، یہ لقب مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھنے والے علماء کے لیے استعمال ہوتا ہے، عرب میں قدیم زمانہ سے انساب، عربیت، شاعری اور ایام و حروب کے جاننے والوں کو علامہ کہا جاتا تھا، عہد رسالت میں بھی ان علوم کے جامع شخص کو علامہ کہتے تھے، چنانچہ علامہ ابن عبد البر اندلسیؒ نے جامع بیان العلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل المسجد فرای جمعاً من الناس علی رجل فقال وما ھذا، قالوا یا رسول اللہ رجل علامۃ، قال وما العلامۃ، قالوا اعلم الناس بانساب العرب واعلم الناس بعربیۃ، واعلم الناس بشعر واعلم الناس بما اختلف فیہ

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبویؐ میں تشریف لائے اور دیکھا کہ لوگوں کی ایک جماعت ایک آدمی کے گرد جمع ہے، آپ نے دریافت فرمایا کیا معاملہ ہے لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ ایک علامہ شخص ہے، آپ نے فرمایا کہ علامہ کیا ہوتا ہے؟ لوگوں نے کہا علامہ وہ شخص ہے جو انساب عرب، عربیت، شعر و شاعری اور عربوں کے حالات کا

العرب، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھذا علم لا ینفع وجھل لا یضر[1]

سب سے بڑا عالم ہے، آپ نے فرمایا یہ ایسا علم ہے کہ نہ اس کا جاننا مفید ہے اور نہ جاننا مضر ہے۔

اس ارشاد نبوی کے بعد بے ضرر اور غیر مفید علوم کے جاننے والوں کے لیے علامہ کا لقب صحابہ کرام کے نزدیک کچھ زیادہ وقیع نہیں رہ گیا، غالباً یہی وجہ ہے کہ عہد رسالت اور صحابہ و تابعین کے زمانہ میں علمائے دین کے لیے یہ لقب نہیں استعمال ہوتا تھا، اور تاریخ و رجال کی کتابوں میں بھی صدر اسلام کے علماء کے لیے یہ لقب نہیں ملتا ہے، مگر بعد میں اس کا عام رواج ہوگیا،

معلم دینی تعلیم دینے والے کو اسلام میں سب سے پہلے معلم کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، یہ وہ مقدس لقب ہے جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں پسند فرمایا ہے، اور انما بعثتُ معلماً فرما کر اس کی عظمت بتائی ہے، اس لقب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی نوازا، چنانچہ وہ صحابہ میں اس لقب سے مشہور رہے، علامہ ابن سعدؒ نے حنان بن ایاد سے روایت کی ہے کہ میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھا کرتا تھا،

فاذا خطب عمر سمعتہ یقول اشھد انک معلم

اور جب حضرت عمرؓ جمعہ کا خطبہ پڑھتے تو میں عبد الرحمٰن بن عوفؓ کو یہ کہتے ہوئے سنتا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ معلم ہیں،

یہ واقعہ سن کر اس کے راوی حضرت عبد الرحمٰن بن ابی الزنادؒ کو تعجب ہوا تو میں نے ان سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث بیان کی۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ما من نبی الا فی امتہ معلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر نبی کی امت میں وہ ایک معلم ہوا کرتے ہیں،

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۳ طبع مصر و کنز العمال ج ۵ ص ۲۰۳ طبع اول حیدرآباد

او معلمان، وان یکن فی امتی	اگر میری امت میں کوئی معلم ہے تو عمرؓ بن خطاب
احد فابن الخطاب، ان الحق علی	ہے، حقیقت یہ ہے کہ حق عمر کی زبان
لسان عمر و قلبہ[1]	اور دل پر ہے،

چونکہ یہ لقب تعلیم دینے والے کے مفہوم کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے، اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں اور حضرت عمرؓ کے بارے میں استعمال فرمایا ہے، اس لیے اسے بعد میں بڑا حسنِ قبول حاصل ہوا، اور مکاتب کے معلموں سے لیکر حدیث و فقہ کے پڑھانے والوں تک کو معلم کے لقب سے پکارا گیا، ابن قتیبہؒ نے کتاب المعارف میں اور ابن رستہ نے الاعلاق النفیسہ میں "اسماء المعلمین" کے عنوان سے ایسے بہت سے بزرگوں کا ذکر کیا ہے، جو معلم کے لقب سے مشہور تھے، مثلاً

(۱) ابو صالح صاحب الکلبی، یہ بچوں کو تعلیم دیتے تھے (۲) ابو عبید الرحمٰن السلمی، یہ دونوں آئمہ کے اندھے تھے (۳) معبد جہنی (۴) ضحاک بن مزاحم (۵) عبد اللہ بن حارث، یہ دونوں حضرات بلا اجرت تعلیم دیتے تھے۔ (۶) قیس بن سعد (۷) عطاء بن ابی رباح مکی (۸) ابو امیہ عبد الکریم، (۹) قاسم بن غیمرہ ہلالی (۱۰) کمیت بن زید شاعر، یہ کوفہ کی مسجد میں بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے (۱۱) عبد الحمید الکاتب، یہ بنو امیہ کے میر منشی بھی تھے (۱۲) ابو البیداء (۱۳) ابو عبد اللہ، یہ خلفائے بنو امیہ کے خطوط و فرامین بھی لکھا کرتے تھے (۱۴) حجاج بن یوسف، عراق کی گورنری سے پہلے طائف میں روٹی لیکر بچوں کو پڑھایا کرتا تھا (۱۵) حجاج کا باپ یوسف بھی معلم تھا (۱۶) علقمہ بن ابی علقمہ مولی حضرت عائشہؓ، ان کا ذاتی مکتب تھا جس میں عربیت النحو اور عروض کی تعلیم دیتے تھے، (۱۷) ابو معاویہ شیبان بن عبد الرحمٰن نحوی مولی بنو تمیم، یہ محدث تھے، اور داؤد بن علی کے بچوں کو ادب کی تعلیم بھی دیتے تھے (۱۸) ابو سعید محمد بن مسلمہ بن ابی الوضاح قضاعی، یہ خلیفہ

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ قسم ۲ ص ۹۹ طبع لیڈن۔

مہدی کے معلم تھے (۱۹) ابو اسمٰعیل ابراہیم بن سلیمان مودب، آپ محدث تھے (۲۰) ابو عبید قاسم بن سلام، یہ بہت بڑے عالم اور محدث و فقیہ اور طرسوس کے قاضی تھے، ۲۲۴ھ میں مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے[1]، ان میں سے اکثروں کے ساتھ لفظ معلم بالالتزام استعمال کیا جاتا تھا، جیسے حسین بن ذکوان حسین المعلم اور حبیب مولی معقل بن یسار حبیب المعلم،

یہ ایک سرسری فہرست ان چند ناموں کی ہے جو عہد صحابہ و تابعین اور تبع تابعین سے لیکر تیسری صدی تک معلم کے لقب سے خاص طور سے مشہور ہوئے، بلکہ چوتھی صدی تک دنیائے اسلام کے بعض علاقوں میں عام طور سے علمائے دین کو معلم کے لقب سے پکارا جاتا تھا، علامہ مقدسی بشاریؒ نے (جنھوں نے ۳۷۵ھ میں اپنی کتاب احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم لکھی ہے) اقلیم دیلم کے بیان میں لکھا ہے کہ

لیسمون العالم معلماً و ربما	یہاں کے لوگ عالم کو معلم کے لقب سے یاد کرتے
تعلقوا بی وقالوا الوک معلم	ہیں اور بسا اوقات مجھے لوگ معلم یعنی زبردست
واللوک ھوالجید[2]	عالم کہکر میرے پیچھے پڑ جاتے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قومس، جرجان، شہرستان، طبرستان، آمل، دیلمان، دامغان، سمنان، بسطام، بیار، استرآباد، طالقان وغیرہ میں عام علماء کو معلم کے لقب سے پکارا جاتا تھا، مقدسی نے ان تمام مقاموں کو اقلیم دیلم میں شمار کیا ہے،

مگر بعد میں یہ مقدس اور قدیم لقب، دوسرے القاب کے مقابلہ میں بہت کم استعمال ہونے لگا، اور عام طور سے معلم کی جگہ مدرس نے لے لی، ہمارے علم میں تعلیم کے اصول و آداب پر سب سے پہلی کتاب امام محمد بن سحنون بن سعید متوفی ۲۵۶ھ کی آداب المعلمین ہے، جو بلاد مغرب میں عام طور سے رائج ہے،

---

[1] کتاب المعارف طبع مصر ص ۲۳۸ [2] احسن التقاسیم ص ۳۶۹

اور اس تعلم کے آداب و اصول پر سب سے مشہور کتاب شیخ برہان الدین مرغینانی کی تعلیم المتعلم ہے۔

مُقری | پڑھنے پڑھانے والے علمائے دین کے لیے معلم کی طرح مقری کا لقب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بولا جانے لگا تھا، مگر اس میں معلم کی طرح تعلیم دینے کا عمومی مفہوم نہیں تھا، بلکہ اس کی ابتدا قرآن کی تعلیم دینے والوں سے ہوئی، اور اس کے مفہوم میں خاص طور سے قرآن کے معلم کا تصور تھا، اس لقب کا اطلاق سب سے پہلے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ پر ہوا، جب ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اہل مدینہ کی خواہش پر قرآن کی تعلیم کے لیے روانہ فرمایا تھا، اس وقت مدینہ کے لوگوں نے ان کو مقری کے لقب سے ملقب کیا، اور یہ ان کا مستقل لقب ہوگیا، امام طبرانی نے معجم کبیر میں روایت کی ہے کہ

ورجع مصعب الی النبی صلی اللہ	اور مصعبؓ مدینہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
علیہ وسلم وکان یدعی المقری [1]	میں حاضر ہوئے اس وقت ان کو مقری کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

چونکہ مقری کے لقب میں شروع ہی سے قرآن کی تعلیم کا تصور تھا، اس لیے بعد میں بھی اسے معلمین قرآن ہی کے لیے استعمال کیا گیا، البتہ قرآنی تعلیم کے عام مفہوم کے علاوہ اس میں صرف تجوید و قرأت کے ساتھ پڑھانے کا تصور بھی شامل ہوگیا، چنانچہ تیسری صدی تک کے مجودین و قرا، اسی لقب سے یاد کیے جاتے تھے، چند مشہور مقریوں کے نام یہ ہیں: (۱) ابوجعفر یزید بن قعقاع مقریٔ مدینہ (۲) ابوعبدالرحمٰن سلمی کوفی یہ مقری کے ساتھ ساتھ فقیہ بھی تھے (۳) شیبہ بن نصاح مقریٔ مدینہ، مولیٰ حضرت ام سلمہؓ، آپ اپنے وقت میں اہل مدینہ کے امام تھے (۴) نافع بن عبدالرحمٰن مقریٔ مدینہ، آپ فن تجوید وقرأت کے زبردست اور مشہور امام ہیں (۵) طلحہ بن عوف، اہل کوفہ کے قاری و مقری ہیں (۶) یحیی بن وثاب کوفی (۷) حمزہ زیات (۸) عاصم بن ابی النجود (۹) حمید الاعرج مقری اہل مکہ (۱۰) ابن کثیر وغیرہ [2]، یہ لقب ان میں سے بعض بزرگوں کے نام کا جز ولاینفک ہوگیا تھا، مثلاً امام ابوعبد الرحمٰن المقری، عبداللہ بن ابی اسحاق المقری وغیرہ، ہندوستان میں عام طور سے قاری اور مقری دونوں کے لیے

---

[1] مجمع الزوائد ج ۹ ص ۹ [2] کتاب المعارف ص ۲۳۰ و ۲۳۲

قاری کا لقب استعمال ہوتا ہے۔

قاری | جس طرح ابتدا میں مقری کا لقب قرآن پڑھانے والوں کے لیے مخصوص تھا اسی طرح قاری کا لقب قرآن پڑھنے والوں کے لیے مخصوص تھا، مگر قرآن پڑھنے کا مطلب صرف اس کے الفاظ کی تجوید و قرأت کے ساتھ ادائیگی ہی نہیں تھا، بلکہ جملہ قرآنی علوم و فنون اس میں شامل تھے، چنانچہ دور رسالت کے بعد ہی قرأ فقیہ، محدث وغیرہ کے القاب سے یاد کیے جانے لگے اور یہ جامع لفظ مختلف الفاظ میں تقسیم ہوگیا، علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں اس کی تفصیل یہ بیان کی ہے۔

ثم ان الصحابة کلهم لم یکونوا	پھر تمام صحابہؓ نہ مفتی تھے اور نہ سب سے دینی علوم
اهل فتیا ولا کان الدین	حاصل کیے جاتے تھے، بلکہ یہ چیز صرف حاملین قرآن
یوخذ عن جمیعهم وانما کان	کے ساتھ مخصوص تھی، جو اس کے ناسخ ومنسوخ
ذالک مختصاً بالحاملین للقرآن	اور متشابہ ومحکم اور اس کی دوسری تمام
العارفین بناسخه ومنسوخه	دلالتوں کے عالم تھے جن کو انھوں نے
ومتشابهه ومحکمه وسائر	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا تھا،
دلالته بما تلقوه من النبی	یا ان لوگوں سے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ
صلی اللہ علیه وسلم اومن سمعه	علیہ وسلم سے حاصل کیا تھا ایسے ہی لوگ قرآن پڑھتے تھے
منهم من علیتهم وکانوا یسمون	ان کو قرا کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ اس
لذالک القراء الذین یقرؤن	وقت عرب امی قوم تھے، اس لیے کتاب اللہ
الکتاب، لأن العرب کانوا امة	پڑھنے والوں کے لیے یہ لقب مخصوص ہوگیا
أمیة فاختص من کان منهم	صدر اسلام تک یہ اصطلاح جاری رہی،
قارئاً للکتاب اللہ بهذا الاسم	پھر جب اسلامی شہروں کی کثرت ہوئی

لغرابته يومئذ وبقى الامر كذالك	اور قرآن کی ممارست کی وجہ سے
صدر الملة، ثم عظمت امصار	عربوں سے امیت جاتی رہی اور وہ
الاسلام وذهبت الامية من	مسائل کے استنباط کا رواج ہوا
العرب بممارسة الكتاب وتمكن	اور علم فقہ کمل ہو کر ایک مستقل
الاستنباط وكمل الفقه واصبح	فن بن گیا، تو لوگوں نے قراء کے
صناعة وعلماً فبدلوا باسم	بجائے فقہاء اور علماء کے نام
الفقهاء والعلماء من القراء[1]	رائج کیے۔

جس طرح جماعتِ صحابہؓ میں مقری کا لقب سب سے پہلے حضرت مصعب بن عمیرؓ کے لیے استعمال کیا گیا، اسی طرح قاری کا لقب سب سے پہلے جماعت صحابہؓ میں حضرت سعد بن عبیدؓ کے لیے استعمال ہوا، طبقات ابن سعد میں ہے

وكان يسمى القارى ولم يكن	حضرت سعد بن عبیدؓ کو قاری کے لقب سے یاد کیا جاتا
احد من اصحاب رسول الله	تھا، جماعت صحابہ میں ان کے علاوہ کوئی
صلى الله عليه وسلم يسمى القارى غيره[2]	دوسرا قاری نہیں کہلاتا تھا،

قاری کا لقب صحابۂ کرام میں اگرچہ سب سے پہلے حضرت سعد بن عبیدؓ کے لیے استعمال کیا گیا، مگر یہ لقب حاملین علوم قرآن کے لیے زمانۂ رسالت ہی میں عام ہو گیا تھا، اور جن صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں قرآن پڑھا اور حفظ کیا تھا ان کو قاری کہنے لگے، یہ صحابہ عام طور سے قرآن کی تعلیم پر مامور ہوتے تھے، مسجد نبوی اور مدینہ منورہ کے مختلف مقامات پر ان کی مجلس درس جاری رہتی تھی، اور بوقت ضرورت ان کو نو مسلم قبائل کی تعلیم کے لیے باہر بھی بھیجا جاتا تھا، اس سلسلہ

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۴، ۴۰۳ [2] طبقات ابن سعد جلد ۳ قسم ۲ ص ۳

میں ستر قراء صحابہ کا واقعہ بہت مشہور ہے، جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھانے کے لیے روانہ فرمایا تھا، مگر وہ راستہ میں شہید کر دیے گئے،

صدر اسلام کا یہ لقب پہلی صدی تک جاری رہا اور اور علمائے دین قراء کہلاتے رہے، چنانچہ بنو امیہ کے خلاف عبد الرحمٰن بن اشعث کی سرکردگی میں یہی قراء ظلم و فساد کے خلاف جنگ کے لیے نکلے تھے، مگر جب باقاعدہ دینی علوم کی تدوین ہوئی تو یہی قراء، فقہاء اور محدثین وغیرہ کے لقب سے یاد کیے جانے لگے اور جن کو جس علم وفن سے زیادہ تعلق تھا انکو اسکی مناسبت سے ملقب کیا گیا، بعد میں قاری کا لفظ اپنے قدیم مفہوم و معنی سے ہٹ کر قرآن کو تجوید و قرأت سے پڑھنے پڑھانے والے کے لیے استعمال ہونے لگا، بعض حضرات اس فن میں اتنے مشہور ہوئے کہ یہ لقب ان کے نام کا جز ہو گیا، جیسے متقدمین میں سلام القاریؒ اور متاخرین میں ملا علی قاری وغیرہ۔

کامل | کامل کا لقب زمانۂ جاہلیت اور صدر اسلام میں علمی اور فنی مہارت کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا تھا، جس کے مفہوم میں عربی لکھنے پڑھنے کے ساتھ تیراکی اور تیر اندازی میں بھی مہارت شامل تھی، علامہ ابن سعدؒ حضرت اوس بن خولیؓ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

وكان اوس بن خولى من الكملة	اوس بن خولی کاملین میں شمار ہوتے تھے۔
وكان الكامل عندهم فى الجاهلية	عربوں کے نزدیک زمانۂ جاہلیت اور صدر اسلام
واول الاسلام الذى يكتب	میں کامل وہ شخص ہوتا تھا جو عربی زبان میں
بالعربية ويحسن العوم والرمى	لکھتا تھا اور تیراکی اور تیر اندازی اچھی طرح
وقد كان اجتمع ذلك فى اوس	جانتا تھا، یہ سب باتیں اوس بن خولی
بن خولى[1]	میں پائی جاتی تھیں،

[1] طبقات ابن سعد جلد ۳ قسم دوم ص ۹۱

اس لیے صحابہ میں بھی جو بزرگ ان چیزوں میں مہارت رکھتے تھے، وہ کامل کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، چنانچہ حضرت اسید بن حضیرؓ، حضرت سعید بن عبادہؓ اور حضرت رافع بن مالکؓ رضی اللہ عنہم کامل کے لقب سے مشہور تھے۔[1]

چونکہ کامل کے لقب میں صرف علوم دین ہی میں مہارت و کمال کا تصور نہیں بلکہ دوسرے فنون بھی شامل تھے، اس لیے بعد میں اس کا استعمال علمائے اسلام کے لیے خاص نہیں رہا اور نہ اس کا رواج ہوا بلکہ بطور صفت کے ہر علم و فن کے ماہر کو کامل کہا جانے لگا۔

کاتب | کاتب کا لقب زمانۂ رسالت میں بہت باعظمت تھا، اور وہ حضرات کاتب کے لقب سے ملقب کیے جاتے تھے، جو وحی الٰہی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرامین اور خطوط کی کتابت کیا کرتے تھے، جماعت صحابہ میں یوں تو بہت سے کاتب تھے مگر حضرت حنظلہ بن ربیعؓ خاص طور سے کاتب کے لقب سے مشہور تھے، علامہ ابن سعدؒ ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں

کتب للنبی صلی اللہ علیہ وسلم	حنظلہ بن ربیعؓ نے ایک مرتبہ رسول اللہ
مرۃ کتاباً فسمی لذالک	صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک تحریر لکھی تھی
الکاتب[2]	اس وقت سے وہ کاتب کے نام سے مشہور ہوگئے،

صحابۂ کرام میں جو بزرگ وحی و احکام رسول کے خصوصی کاتب تھے ان کے نام علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں درج کیے ہیں (۱) حضرت ابوبکرؓ (۲) حضرت عمرؓ (۳) حضرت عثمانؓ (۴) حضرت علیؓ (۵) حضرت زبیرؓ (۶) حضرت عامر بن فہیرہ (۷) حضرت عمرو بن عاص (۸) ابی بن کعب (۹) حضرت عبداللہ بن ارقم (۱۰) حضرت زید بن ثابت بن قیس بن شماس (۱۱) حضرت حنظلہ بن ربیع اسدی (۱۲) حضرت مغیرہ بن شعبہ (۱۳) حضرت عبداللہ بن رواحہ (۱۴) حضرت خالد بن ولید (۱۵) حضرت

[1] طبقات ابن سعد ج ۳ قسم اول بالترتیب ص ۱۳۶، ۱۴۳، ۱۴۰ [2] ایضاً ج ۶ ص ۳۶

خالد بن سعید بن عاص، کہا جاتا ہے کہ کتابت وحی کی خدمت سب سے پہلے انہی نے انجام دی (۱۶) حضرت امیر معاویہؓ (۱۷) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم، آپ تمام کاتبین وحی و احکام میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔[1]

خلفائے راشدین کے زمانہ تک جو لوگ مکاتیب و فرامین لکھنے پر مامور تھے ان کو بھی کاتب کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، اور بعد میں بعض علماء و مصنفین کے شاگرد جو استاد کا لکھنے کا کام انجام دیتے تھے وہ بھی کاتب کے نام سے مشہور ہوئے، جیسے واقدی کے کاتب علامہ محمد بن سعد صاحب طبقات کاتب الواقدی سے مشہور ہیں،

بنو امیہ اور بنو عباس کے دور میں کتابت و انشاء کا عہدہ سکریٹریٹ کا ہم معنی بن گیا اور سرکاری دفاتر میں کام کرنے والوں کو کاتب اور منشی کہنے لگے، اموی دور میں عبد الحمید الکاتب نے اس میں بڑی شہرت حاصل کی، وہ اس درجہ کا کاتب تھا کہ اس نے کتابت کے اعتبار سے عربی رسم الخط میں کئی شکلیں ایجاد کیں، اور طرز تحریر میں نئے نئے اسلوب ایجاد کیے۔ اسی طرح ابو العباس احمد بن محمد الکاتب متوفی ۲۷۰ھ، ابن العمید الکاتب، ابو الفضل محمد بن عمید الکاتب، ابو عبید اللہ حسین ابن معد الکاتب متوفی ۳۹۶ھ، ابن النعاد الکاتب، ابو علی محمد بن علی بن حسین بن مقلہ الکاتب متوفی ۳۲۸ھ، ابن الجان الکاتب۔ اور ابو الفوارز بن حسین بن علی بن حسین الکاتب متوفی ۵۰۲ھ وغیرہ فن کتابت و انشاء میں اتنے مشہور ہوئے کہ ان کے نام کے ساتھ یہ لقب بھی استعمال کیا جانے لگا،[2]

بعد میں یہ لقب ان لوگوں کے لیے بولا جانے لگا جو انشاء پردازی اور خوشنویسی میں درجۂ کمال رکھتے تھے، آجکل لغوی معنی کے ساتھ عربی اخبارات و رسائل کے مدیر اور مقالہ نگاروں کو بھی کاتب اور منشی کہتے ہیں،

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۳۱ [2] ان کے حالات کے لیے تاریخ ابن خلکان میں ان کے تذکرے ملاحظہ ہوں،

مُکتِب | مکتب کے لقب سے وہ لوگ پکارے جاتے تھے جو عربی رسم الخط کی کتابت میں کمال رکھتے تھے، اور بچوں کو اس کی تعلیم بلکہ عربی رسم الخط کی تعلیم کے ساتھ ادب ولغت کی بھی تعلیم دیتے تھے، علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے:

هذه النسبة الى تعليم الخط	مکتب کی نسبت عربی رسم الخط کی طرف ہے اور
ومن يحسن ذالك ويعلم الصبيان	جو آدمی خوشنویس ہوتا ہے اور بچوں کو رسم
الخط والادب [1]	الخط اور ادب کی تعلیم دیتا ہے اس کو مکتب کہتے ہیں۔

جو لوگ ابتدا میں مکتب کے لقب سے مشہور ہوئے، علامہ سمعانی نے ان کے یہ نام بتائے ہیں:۔ ابو سالم المکتب کوفی۔ حسین بن ذکوان المعلم المکتب بصری، عتبہ بن عمرو المکتب کوفی، ابو الطیب محمد بن جعفر بن یزید المکتب بغدادی، ابو بکر محمد بن علی بن حسن المکتب عنبری بغدادی اور عبید بن عمرو المکتب، ہمارے خیال میں مکتب کا لقب قدیم زمانہ میں اسی معنی کو ظاہر کرتا تھا جسے ہمارے زمانہ میں "میاں صاحب" اور "میاں جی" کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں،

مؤدِّب | مسلمان بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کے لیے محلوں میں چھوٹے چھوٹے مکاتب ہوا کرتے تھے، ان میں تعلیم دینے والوں کو معلم اور مکتب وغیرہ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ خلافت راشدہ اور اس کے کچھ بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا، ان مکاتب میں عام مسلمانوں کے بچے پڑھتے تھے، مگر بعد میں جب خلفاء اور امراء کے بچوں کو ان کے گھروں پر تعلیم دینے کا رواج ہوا اور ان کی مخصوص ضرورت کے مطابق دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ تاریخ، شعر و ادب اور اخلاق وغیرہ کی بھی تعلیم دی جانے لگی تو اس قسم کے معلمین مؤدب کے لقب سے پکارے جانے لگے، یہ لوگ عام

[1] کتاب الانساب لفظ مکتب

طور سے علم الانساب، تاریخ و ثقافت اور شعر و ادب میں ماہر ہوا کرتے تھے، فقہاء و محدثین خلفاء و امراء کے بچوں کو عام تعلیمی حلقوں سے الگ تعلیم دینا پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے وہ اس سے عام طور سے الگ رہے، علامہ سمعانی کا بیان ہے،

المؤدب هذا اسم لمن يعلم	مؤدب اس شخص کا نام ہے جو بچوں اور عام لوگوں
الصبيان والناس الادب واللغة	کو ادب اور لغت کی تعلیم دیتا ہے،

مندرجۂ ذیل مؤدب اپنے اپنے دور میں خاص شہرت کے مالک ہوئے (۱) صالح بن کیسان المؤدب مدنی، حضرت عمر بن عبد العزیز کے مؤدب تھے (۲) ابو زکریا یحییٰ بن محمد بن قیس المؤدب مصری بنی جعفر کے مؤدب تھے (۳) ابو اسمٰعیل ابراہیم بن سلیمان بن رزین المؤدب، آل عبید اللہ کے مؤدب تھے (۴) ابو سعید المؤدب، مشہور مؤدبوں میں سے ہیں، [1]

ماہر انساب و عربیت شرقی بن قطامی کو خلیفہ منصور نے اپنے لڑکے مہدی کا مؤدب مقرر کیا تھا، امام ادب مفضل ضبی بھی مہدی کو لغت و ادب کی تعلیم دیتے تھے، امام کسائی نحوی ہارون رشید کے لڑکے امین کے مؤدب تھے، [2] ابو محمد یزیدی، خلیفہ مہدی کے ماموں یزید بن منصور کو تعلیم دیتے تھے اسی لیے یزیدی کی نسبت سے مشہور ہوئے، [3] فراء نحوی خلیفہ مامون کے دونوں لڑکوں کو پڑھاتے تھے، امام ابن سکیت، امیر ابن طاہر کے لڑکے کو ادب کی تعلیم دیتے تھے، چونکہ اس زمرہ میں فقہاء و محدثین بہت کم شامل ہوئے اور اس میں ادیبوں ہی کا زیادہ حصہ رہا اس لیے یہ لقب زیادہ رواج نہ پا سکا۔

منشی | علامہ سمعانی منشی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

هذه النسبة الى انشاء الكتب	منشی کی نسبت سرکاری دفتروں اور خطوط
الديوانية والرسائل [4]	و فرامین لکھنے کی طرف ہے،

[1] کتاب الانساب لفظ مؤدب [2] فہرست ابن ندیم ص ۱۰۲ [3] ایضاً ص ۴۸ [4] کتاب الانساب لفظ منشی

منشی کے لقب سے یہ حضرات مشہور ہوئے:

(۱) ابو اسمٰعیل حسین بن علی بن عبد الصمد المنشی اصفہانی عراق کے صدر دیوان تھے، اور اس فن میں دنیا میں مشہور تھے (۲) ابو الفضل محمد بن عاصم المنشی سلطان سنجر بن ملک شاہ کے یہاں انشاء کی خدمت پر مامور تھے، ۵۴۱ھ یا ۵۴۲ھ میں انتقال کیا (۳) ابو الفرج عبد اللہ بن احمد حضرمی ابن المنشی متقدمین میں مشہور تھے۔[۱]

بعد میں یہ لقب خاص طور سے انشاء پردازوں کے لیے استعمال ہونے لگا، آجکل عربی اخبارات و رسائل کے اڈیٹر اور رئیس التحریر کو بھی منشی کہتے ہیں،

خطیب خطیب کا لقب خطبہ اور خطابت سے ماخوذ ہے، ابتدا میں ان فصحاء و بلغاء کو خطیب اور خطباء کہا جاتا تھا جو فن خطابت میں کمال رکھتے تھے، اور زبان دانی و زبان آوری میں مشہور تھے، اور تقریر کے ذریعہ سحر بیانی کرتے تھے، مگر بعد میں یہ لقب ایسے علماء کے لیے مخصوص ہو گیا جو منبروں پر جمعہ کا خطبہ دیتے تھے، اور وعظ کہتے تھے، علامہ سمعانی کا بیان ہے

ھذہ النسبۃ الی الخطابۃ علی المنابر[۲]	خطیب کی نسبت منبروں پر خطابت و تقریر کرنے کی طرف ہے،

جمعہ کے خطیب عام طور سے امامت بھی کیا کرتے تھے، چند خطیبوں کے نام یہ ہیں (۱) ابو بکر احمد ابن علی بن ثابت خطیب بغدادیؒ صاحب تاریخ بغداد (۲) شکیب بن شیبہ خطیب بصریؒ، یہ خطیب منبر نہیں تھے، بلکہ فصیح و بلیغ خطیب تھے (۳) ابو محمد عقیل بن عمرو بن بکر بن سلیمان خطیب نیشا پوریؒ سب سے پہلے ان کے دادا بکر بن سلیمان کو خطیب کا لقب ملا، پھر ان کے والد عمرو بن بکر خطیب ہوئے، ابو محمد عقیل نیشا پور کے حاکم بھی تھے، اور اپنی حکومت کے زمانہ میں خطابت کی خدمت بھی

[۱] کتاب الانساب لفظ منشی [۲] کتاب الانساب ورق ۲۰۴

انجام دیتے تھے، ۴۸۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

چوتھی صدی میں خطیبوں کا خاص لباس ہوتا تھا، اور وہ عبا، و قبا، پہنکر خطبہ دیتے تھے، مگر خراسان کے خطیب ان کے بجائے درّاعہ نامی لباس استعمال کرتے تھے، مقدسی کا بیان ہے

ولا یتردّی الخطیب ولا یتقبّی انما علیہ درّاعۃ ولا یسرع الخروج[۱]	خراسان کا خطیب جمعہ کا خطبہ دیتے وقت چادر اور قباء استعمال نہیں کرتا بلکہ اس کے جسم پر دراعہ ہوتا ہے، نیز خطیب اپنے حجرہ سے نکلنے میں جلدی نہیں کرتا۔

ان خطیبوں اور اماموں کے لیے صاحب علم و فضل ہونے کے ساتھ ساتھ موثر انداز خطابت رکھنا ضروری تھا،

مُذکّر مذکّر کا لقب تذکیر سے ماخوذ ہے، جس کے معنی یاد دلانے والے اور نصیحت کرنے والے کے ہیں، یہ لقب سب سے پہلے قرآن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال کیا ہے: اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ دوسری جگہ فرمایا گیا، وَذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

بعد میں یہ لقب ان وعظ و نصیحت کرنے والے علماء کے لیے بولا جانے لگا جو عام مسلمانوں کو دینی احکام بتاتے اور عذاب و ثواب اور جنت و جہنم وغیرہ کو یاد دلاتے تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں:

ھذہ اللفظۃ لمن یذکر و یعظ[۲]	یہ لفظ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو وعظ و نصیحت کرتا ہے،

جو علمائے دین خاص طور سے مذکر کے لقب سے مشہور ہوئے، ان میں سے چند یہ ہیں:-

(۱) ابو محمد عبد الواحد ابن احمد زہری المذکر صائم الدہر تھے، ہر دوسرے دن قرآن ختم کرتے تھے،

[۱] احسن التقاسیم ص ۳۲۲ - بڑی بڑی مسجدوں میں امام اور خطیب مسجد سے متصل اپنے حجروں میں رہتے تھے اور خطبہ اور نماز کے قریب نکلتے تھے، دہلی کی جامع مسجد میں آجتک یہ دستور قائم ہے [۲] کتاب الانساب ورق ۵۱،

مشہور صحابی حضرت عبد الرحمن بن عوف کی اولاد میں سے تھے، ۳۸۲ھ میں انتقال فرمایا (۲) ابوبکر محمد بن عبد اللہ بن عبد العزیز بن شاذان المذکر، رازی بڑے شیریں زبان اور ہنس مکھ بزرگ تھے، علم حدیث کے ساتھ تصوف کے اسرار و حقائق کے بھی عارف تھے، ۳۷۶ھ میں وفات پائی (۳) ابوبکر محمد بن علی بن حسین المذکر نیشاپوری، آپ کوچۂ عیسیٰ بن ماسرجس کی مسجد میں وعظ و تذکیر فرماتے تھے، ۳۴۰ھ میں وفات پائی (۴) ابو العباس احمد بن محمد بن علی بن عمر المذکر نیشاپوری، متوفی ۳۶۴ھ (۵) ابو محمد عبد اللہ بن ابی القاسم عمر بن عبد اللہ ابن ہیثم المذکر اصفہانی بڑے دیندار اور فاضل بزرگ تھے، حدیث کے بھی بڑے عالم تھے، [1]

بعد میں یہ لقب واعظ کے ہم معنی ہو گیا، اور چوتھی صدی تک وہ واعظ، مذکر کے خطاب سے یاد کیے جانے لگے جو فن وعظ و تذکیر میں مہارت رکھتے تھے، علامہ مقدسی بشاری نے احسن التقاسیم میں (جو ۳۷۵ھ کی تصنیف ہے) ہر اقلیم اور ہر مقام کے مذکروں کا حال بیان کیا ہے، مثلاً اقلیم شام کے شہر ایلیاء کے بیان میں لکھتے ہیں:-

والمذکرون به قصاص [2]	ایلیا کے مذکر قصہ گو ہوتے ہیں۔

اقلیم خراسان کے بیان میں لکھتے ہیں:-

وللمذکرین به صیت عجیب [3]	یہاں مذکروں کی بڑی شہرت ہے،

اقلیم دیلم کے بیان میں لکھتے ہیں:-

ورسمهم بجرجان ان التذکیر للفقهاء واهل الروایات [4]	جرجان میں رسم ہے کہ وعظ و تذکیر فقہاء اور اہل روایات کے لیے مخصوص ہے،

رے کے بیان میں ہے:-

---

[1] کتاب الانساب ورق ۵۱۰ [2] احسن التقاسیم ص ۱۶۲ [3] ایضاً ص ۳۲۳ [4] ایضاً ص ۳۶۸

ولمذکریهم فنٌ [1]	یہاں کے مذکروں کو تذکیر کا فن آتا ہے۔

اقلیم سندھ کے بیان میں ہے:-

ولیس للمذکرین به صیت	یہاں پر مذکروں کا چرچا نہیں ہے اور
ولا لهم رسوم تذکیر [2]	نہ یہاں کے باشندوں میں اس کا رواج ہے۔

چوتھی صدی کے بعد مذکر کا رواج کم ہو گیا اور اس کی جگہ واعظ کے لقب نے لے لی۔

واعظ مذکر اور واعظ دونوں تقریباً ہم معنی ہیں، مگر واعظ کی اصطلاح مذکر کے مقابلہ میں نئی ہے، علامہ سمعانی نے چند مشہور واعظوں کے نام لکھے ہیں، جیسے (۱) ابو القاسم بکر بن شاذان الواعظ، متوفی ۴۰۵ھ (۲) ابو نصر عبد الرحمن بن محمد بن جعفر عقیلی الواعظ، متوفی ۴۳۲ھ، [3]

واعظوں کی فہرست بہت طویل ہے، اور بڑے بڑے علماء اس لقب سے مشہور ہیں۔

محتسب محتسب کا لفظ ان حضرات کے لیے بولا جاتا ہے جو عام مسلمانوں کے احتساب اور حسبہ کی خدمت انجام دیتے تھے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری سنبھالتے تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں:-

هو ان یامر الناس وینهی عن المنکر	احتساب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نام ہے۔

اس خدمت پر مامور حضرات محتسب کے لقب سے پکارے جاتے تھے، چنانچہ (۱) ابو عبد محمد بن حسن بن یحییٰ بن اشرس بخاری المحتسب (۲) فقیہ ابو حفص احمد بن احمد بن حمران المحتسب (۳) ابو نصر منصور بن محمد بن احمد بن حرب المحتسب (۴) ابو محسن احمد بن علی بن

---

[1] احسن التقاسیم ص ۳۹۱ [2] ایضاً ص ۴۸۴ [3] کتاب الانساب ورق ۵۷۷

حسین بن محمد المحتسب اس خدمت کو انجام دیا کرتے تھے۔[1]

مسلمانوں کے دورِ اقبال میں محکمۂ احتساب ہر سلطنت میں رہتا تھا، آجکل سعودی عرب میں محتسب کو مطوع کہتے ہیں، ہمارے ملک ہندوستان میں بھی مسلمان بادشاہوں کے دور میں یہ محکمہ قائم تھا۔

اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں احتساب کے حدود و شرائط اور اس کے آداب بیان کیے گئے۔ ہمارے علم میں اس موضوع پر سب سے پہلی اور جامع کتاب امام یحییٰ بن عمر الکنانی اندلسی قیروانی متوفی ۲۸۹ھ کی احکام السوق ہے جس میں اسلام کے شہری حقوق اور بازار کے نظام کے احتساب کا مفصل بیان ہے، نیز حضرت شیخ سنانی دہلوی کی کتاب نصاب الاحتساب اس فن میں مشہور ہے، اور حال میں ڈاکٹر مصطفےٰ حسن علوی نے محتسب اسلام کے نام سے اس موضوع پر اردو میں ایک کتاب لکھی ہے، (باقی)

---

[1] کتاب الانساب ورق ۳۱۱

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور پھر یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ (از شاہ معین الدین احمد ندوی) ضخامت ۴۳۲ صفحے

قیمت :- ۸ روپے

"منیجر"

آزاد بلگرامی

از جناب عبدالرزاق صاحب قریشی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

آزاد بلگرامی کا سلسلۂ نسب عیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید بن امام زین العابدین پر منتہی ہوتا ہے، چنانچہ خود آزاد کہتے ہیں:-

گرچہ باشد موتم الاشبال عیسیٰ جدِ من عیسیٰ جان بخش شیر انم باد انفس

چونکہ عیسیٰ اکثر شیر کا شکار کیا کرتے تھے، اس لیے موتم الاشبال کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ایک اور شعر میں اپنے سلسلۂ نسب کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

مرا بہ تیغ ستم گشت وگفت از سرِ ناز چراغ دودۂ زید شہید روشن شد[1]

آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ اکابر طریقت میں سے خواجہ عماد الدین اور سید محمد صغریٰ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے بلگرام کو اپنا وطن بنایا[2]، ایک دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت بلگرام میں سادات حسینی واسطی کے جتنے خاندان آباد ہیں، ان کے جد اعلیٰ یہی سید محمد صغریٰ ہیں۔ ان کا لقب "صاحب الدعوۃ الصغریٰ" تھا، کثرت استعمال سے صغریٰ ہو گیا، ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

سید محمد صغریٰ بن سید علی بن سید حسین بن سید یحییٰ بن سید زید بن سید علی بن سید حسین بن سید علی العراقی بن سید حسین ابن سید علی بن سید محمد بن عیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید بن الامام زین العابدین بن الامام حسین الشہید السبط ابن الامام الہمام اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب زوج فاطمۃ الزہرا بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔[3]

---

[1] آزاد بلگرامی: خزانۂ عامرہ (کانپور ۱۸۷۱ء) ص ۱۲۳ [2] ایضاً: مآثر الکرام (آگرہ ۱۹۱۰ء) ص ۸
[3] ایضاً ص ۱۱

سید محمد صغریٰ خراسان سے ہندوستان آئے[1]، وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید تھے، سلطان شمس الدین التمش کو ان کی ذات سے عقیدت تھی، اس زمانہ میں بلگرام پر سری نام کا ایک ہندو راجہ راج کرتا تھا، وہ بہت متعصب اور مغرور تھا، سلطان نے اس کی تنبیہ کے لیے سید محمد صغریٰ سے درخواست کی، چنانچہ راجہ مع اپنے اعیان و اقارب کے قتل ہوا، اور بلگرام پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، لفظ "خداداد" سے اس فتح کی تاریخ (۶۱۴ھ / ۱۲۱۷ء) نکلتی ہے،

سید محمد صغریٰ نے بلگرام ہی میں سکونت اختیار کر لی، شیوخ فرشوری[2] اور ترکمان بھی جو ان کے ساتھ آئے تھے یہیں رہ پڑے، اس عہد کے دستور کے مطابق غلہ کی پیداوار کا دسواں حصہ انھیں ملتا تھا، اور یہ سلسلہ سلطان ابراہیم بن سلطان سکندر لودھی کے عہد تک جاری رہا،

سید محمد صغریٰ نے ۶۲۷ھ / ۱۲۲۹ء میں سلطان شمس الدین التمش کے حکم سے ایک بلند ٹیکرے پر جو وسط شہر میں تھا، ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا، امتداد زمانہ سے جب قلعہ کی دیواریں ٹوٹ گئیں تو اس کے کتبہ کے پتھر کو محلہ سید واڑہ کی مسجد میں نصب کر دیا گیا، کتبہ کی عبارت یہ ہے:-

"حامی البلاد راعی العباد ذی الامان لاھل الایمان وارث ملک سلیمان صاحب الخاتم فی ملک العالم ظل اللہ فی الخافقین ابو المظفر التمش السلطان ناصر امیر المومنین ادام اللہ تمکینہ فی شھور سبع وعشرین وستمائۃ"

سید محمد صغریٰ فتح بلگرام کے بعد ۳۱ سال زندہ رہے، انھوں نے ۱۴ شعبان (۱۶ نومبر) ۶۴۵ھ / ۱۲۴۷ء کو وفات پائی[3]،

آزاد بلگرامی نے فتح بلگرام سے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ مشکوک ہے، ان کے اس بیان اور بعض دوسرے بیانات پر خود ان کے زمانہ میں اعتراضات ہوئے تھے، چنانچہ شیخ غلام حسن ثمین نے جو اپنے عہد کے بلگرامی

[1] آزاد بلگرامی: ماثر الکرام ص ۱۵ [2] آزاد نے قاضی عبد المنتخب بلگرامی کے حالات میں ضمناً لکھا ہے کہ بلگرام فتح ہو جانے کے بعد مناصب شرعیہ مثلاً افتا، قضا وغیرہ شیوخ فرشوری سے متعلق تھے، اور زمینداری سادات کے حصہ میں آئی (ماثر الکرام ص ۱۵) [3] ایضاً ص ۱۱ تا ۱۳

شیوخ فرشوری کے نمایندہ ہیں، آزاد کے آزادانہ و غیر محتاط بیانات سے متاثر ہو کر شرائف عثمانی تصنیف کی، دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں کہ جب آزاد نے اپنی دو کتابیں، ماثر الکرام اور سرو آزاد، دکن سے بلگرام بھیجیں اور وہ فضلاء و بزرگان بلگرام کی نظر سے گذریں تو وہ حیران و ششدر رہ گئے کیونکہ ماثر الکرام کے اکثر بیانات "تاریخ واسناد و وثائق و فرامین" کے خلاف تھے، اس کتاب کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ "ساقط از اعتبار" ہے، آزاد کے ماموں اور استاد سید محمد بلگرامی سے رجوع کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے خود آزاد سے اس سلسلہ میں دریافت کیا اور وہ اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں[1]۔

شیوخ بلگرام کا دعویٰ ہے کہ ان کے آباء و اجداد سلطان محمود غزنوی کے ساتھ جب اس نے قنوج پر چڑھائی کی، آئے تھے اور ۴۰۵ھ / ۱۰۱۴ء میں راجپوتوں کو شکست دی اور سری نگر کو فتح کر کے اس کا نام بلگرام رکھا، وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں مندرجہ ذیل اشعار پیش کرتے ہیں:-

مسلماں رسیدہ بہ ہندوستاں	ز توراں ہمیں بود صد یقیاں
جنود و جلیس بود انصاریاں	ترکمان و اعوان و انصاریاں
ز چار و صد و خمس ہجری تمام	سری نگر را نام شد بلگرام[2]

یوپی کے ڈسٹرکٹ گزیٹر (ضلع ہردوئی) کا مرتب اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ محمود غزنوی کی فوجیں سری نگر سے گذری ہوں اور غارتگری ہوئی ہو اور چند شیوخ وہاں رہ گئے ہوں، لیکن گمان غالب یہ ہے کہ مسلمان سید سالار کے ساتھ آئے اور بلگرام کو صحیح معنوں میں شیخ محمد فقیہ عراقی نے التمش کے زمانہ میں فتح کیا، انہی شیخ صاحب کے ساتھ سید محمد صغریٰ بھی جو بلگرام کے تعلقہ داروں کے جد اعلیٰ کہلاتے ہیں، آئے تھے[3]،

[1] شیخ غلام حسن ثمین: شرائف عثمانی (قلمی) ایشیاٹک لائبریری کلکتہ [2] سید مقبول احمد صمدانی: حیات جلیل (الہ آباد ۱۹۲۹ء) حصہ اول ص ۳۴ [3] نیول، ایچ، آر: ڈسٹرکٹ گزیٹیر یوپی، جلد ۴۱ (ضلع ہردوئی) (نینی تال ۱۹۰۴ء) ص ۱۸۸

یہ موضوع جس قدر دلچسپ ہے اس سے زیادہ تحقیق طلب ہے، اس لیے اس وقت ہم اسے نظرانداز کرکے آزاد بلگرامی کے سوانح و حالات زندگی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

آزاد کے سوانح و حالات زندگی لکھنے سے پہلے چند لفظ ان کی وطنیت کے متعلق لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مشہور انگریز مورخ ولیم اروِن شیخ غلام حسن ثمین کی روایت پر آزاد کے دعوائے بلگرامیت کو صحیح نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ثمین آزاد کے دعوائے بلگرامیت کا مذاق اڑاتے اور ان پر طنز کرتے ہیں۔ ثمین کا بیان ہے کہ اگرچہ آزاد بلگرامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن حقیقۃً وہ سمرن (ضلع فرخ آباد) کے رہنے والے تھے، ان کی والدہ بلگرام کی تھیں نہ کہ ان کے والد۔[1]

سید مقبول احمد صمدنی (سمدنی) مصنف حیات جلیل بھی ولیم اروِن کے ہمنوا ہیں، وہ ثبوت میں ثمین کا مندرجہ ذیل بیان پیش کرتے ہیں:

"بزرگ حضرات آزاد مذکور از قصبہ سمرن در عہد ملک بہلول لودی در بلگرام برائے تحصیل علم برآمدہ، بعد چندی بوجہ اخلاق اہالیان بلگرام طرح توطن انداختہ، این معنی بر جمہور قدمائے بلگرام بیدا و ہویدا است۔"[2]

شرائف عثمانی ہمارے سامنے نہیں ہے، صرف اس کے دیباچہ کا ایک اقتباس ایک عزیز کی وساطت سے ہم کو مل گیا تھا، جب تک پوری کتاب سامنے نہ ہو یقین و تفصیل سے گفتگو نہیں ہو سکتی، اس لیے اس موضوع پر بھی ہم کبھی آئندہ لکھیں گے، لیکن اس وقت اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر ثمین کے مندرجہ بالا بیان کو صحیح مان لیا جائے تب بھی آزاد کے بلگرامی ہونے میں کوئی شک و شبہہ نہیں، بہلول لودی کا عہد حکومت ۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء سے ۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء تک ہے، اور

---

[1] ولیم اروِن: Indian Culture جلد ۳، (جنوری ۱۹۳۶ء) ص ۱۰۔
[2] سید مقبول احمد: حیات جلیل، حصہ دوم ص ۳

آزاد کا سال پیدائش ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء ہے یعنی آزاد کی پیدائش کے وقت ان کے خاندان کو بلگرام میں آباد ہوئے (بقول ثمین) تقریباً ڈھائی سو سال ہو چکے تھے، ڈھائی سو سال کسی کی وطنیت کو متعین کرنے کے لیے کافی ہیں، اس لیے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آزاد بلگرامی تھے۔

غلام علی آزاد بن سید محمد نوح ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ (۹ جون ۱۷۰۴ء) کو اتوار کے دن محلہ میدان پورہ[1] (بلگرام) میں پیدا ہوئے، بلگرام ہمیشہ سے تعلیم و تربیت کا ایک بڑا اور اہم مرکز رہا ہے، اس کے علاوہ آزاد ایک نہایت مہذب و تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ان کی تعلیم و تربیت کا بہت باقاعدہ انتظام ہوا، خود آزاد کا بیان ہے کہ درسی کتابیں ابتدا سے انتہا تک انھوں نے "استاد المحققین" میر طفیل محمد بلگرامی[2] سے پڑھیں،[3] وہ اس شاگردی پر اس طرح فخر کا اظہار کرتے ہیں:

شاگرد خاص میر طفیل محمدم   اور علوم عقلی و نقلیت رہبرم[4]

عروض و قافیہ اور بعض فنون ادب اپنے ماموں سید محمد[5] سے حاصل کیے، ۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء میں ان کے نانا فاضل اجل میر عبد الجلیل بلگرامی[6] ۱۹ سال کے بعد بلگرام آئے، اس وقت آزاد کی عمر ۱۶ برس تھی، آزاد اور ان کے حقیقی خالہ زاد بھائی میر محمد یوسف[7] نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا، اور "سند حدیث مسلسل بالاولیہ و حدیث الاسودین و اجازت اکثر کتب احادیث" ان سے حاصل کیں۔ ۱۱۳۴ھ/۱۷۲۱ء میں جب میر عبد الجلیل شاہ جہان آباد جانے لگے تو یہ دونوں بھائی بھی ان کے ساتھ گئے

---

[1] اس محلہ کا نام میدان پورہ اس لیے پڑا کہ یہ ایک وسیع اور ہموار قطعۂ زمین پر آباد ہے، جو دریائے گنگ کے بازگشت وگریز سے پیدا ہو گیا تھا (ڈسٹرکٹ گزیٹیر ہردوئی ص ۱۷۱)۔ [2] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو مآثر الکرام ص ۱۴۹ تا ۱۵۰، سرو آزاد ص ۲۵۱ تا ۲۵۳، تذکرہ علمائے ہند ص ۹۸۔ [3] آزاد بلگرامی: سرو آزاد (لاہور ۱۹۱۳ء) ص ۲۹۳ [4] ایضاً [5] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو مآثر الکرام ص ۲۹۳ تا ۲۹۴، سرو آزاد: ص ۲۸۹ تا ۲۹۱، چمنستان شعرا ص ۵۲۵ تا ۵۲۸۔ [6] آزاد: سرو آزاد ص ۲۵۳ [7] ان کے حالات میں سید مقبول احمد صمدنی نے ایک مستقل کتاب حیات جلیل کے نام سے لکھی ہے۔ [8] ان کے حالات کے لیے دیکھیے مآثر الکرام ص ۲۹۷ تا ۲۹۸، سرو آزاد ص ۳۱۳ تا ۳۱۴

اور تین سال وہاں رہ کر "بعض کتب حدیث، برخی از کتاب قاموس و فنون دیگر" ان سے حاصل کیے[1]

آزاد اپنے اس اکتساب فیض کا اس شاعرانہ انداز میں اعتراف کرتے ہیں:

آزاد ما کہ فضل و کمالی بہم رساند — خدمت نمود حضرت عبد الجلیل را[2]

آزاد کو تحصیل علم اور کسب کمال کا کس قدر شوق بلکہ لگن تھی، اس کا اندازہ شفیق[3] کے اس بیان سے ہو سکتا ہے:۔

"(آزاد) می فرمودند در ایام جوانی از بسکہ ہمت مصروف کسب کمال بود التزام داشتم کہ ہر روز فائدہ نوی معلوم کنم، اگر روزی خالی می گذشت می گفتم ایں روز را از عمر نتواں شمرد۔"[4]

اسی ذوق و شوق اور جد وجہد کا نتیجہ تھا کہ آزاد نے بقول صاحب تذکرۂ بے نظیر:

"در تحصیل علوم عقلی و نقلی کسب کار را بکرسی تکمیل نشاندہ واز صحبت اکثری بالانشینان مجالس فضل پایۂ خود بمعراج رساندہ۔"[5]

آزاد چونکہ طبعاً درویش مزاج تھے، اس لیے عین جوانی ہی کے زمانہ میں (۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء) میر سید لطف اللہ عرف شاہ لدھا بلگرامی[6] سے بیعت ہوئے،[7]

آزاد کے ماموں سید محمد سیوستان (سندھ) میں پیشگاہ بادشاہ دہلی کی طرف سے میر بخشی اور وقائع نگار تھے،[8] ۱۱۴۲ھ/۱۷۲۹ء میں (غالباً ماموں کے بلاوے پر) آزاد نے سیوستان کا سفر کیا، وہ ذی الحجہ ۱۱۴۲ھ میں بلگرام سے روانہ ہوئے اور شاہ جہان آباد، لاہور، ملتان،

---

[1] آزاد: مآثر الکرام ص ۲۶۴ [2] شفیق گل رعنا [3] ایضاً [4] عبد الوہاب افتخار دولت آبادی: تذکرۂ بے نظیر (قلمی) ملوکہ کتب خانہ محمد عمران آروی [5] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو مآثر الکرام ص ۱۰۸ تا ۱۱۳ سفینۂ خوشگو ص ۱۷۵، ۱۷۶ [6] آزاد: مآثر الکرام ص ۱۶۲ [7] میر سید محمد سے پہلے آزاد کے والد سید محمد نوح محکمۂ سیوستان کی بخشی گری و وقائع نگاری پر میر عبد الجلیل کی جگہ، سال نیابت کر چکے تھے (مآثر الکرام ص ۲۹۶

ہوتے ہوئے ربیع الاول ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء کے پہلے عشرہ میں وہاں پہنچے، میر سید محمد انھیں اپنا قائم مقام کر کے خود بلگرام چلے آئے اور چار سال کے بعد واپس ہوئے، ان کے واپس آنے کے بعد آزاد نے وطن کا رخ کیا، ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء میں وہ سیوستان سے شاہ جہان آباد آئے، یہاں انھیں خبر ملی کہ ان کے والد اور خاندان کے دوسرے افراد الہ آباد میں ہیں، وہ آگرہ ہوتے ہوئے الہ آباد پہنچے، اور شہر میں ٹھیک اس وقت داخل ہوئے جب لوگ ہلال رمضان دیکھنے میں مشغول تھے، انھوں نے یہاں تین سال قیام کیا، یہاں کے قیام کے دوران میں دو دفعہ بلگرام کا سفر کیا،[1]

سیوستان کے دوران قیام میں آزاد کی پہلی تصنیف وجود میں آئی، انھوں نے فارسی شعرا کا ایک تذکرہ ید بیضا کے نام سے لکھنا شروع کیا جو ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء میں مکمل ہوا، اہل سیوستان نے اس کی متعدد نقلیں لیں، ایک شخص اس کا ایک نسخہ دہلی لے گیا، آزاد جب سیوستان سے وطن لوٹ رہے تھے تو لاہور میں محمد فقیر اللہ آفریں لاہوری سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بڑی خواہش سے اس کتاب کا ایک نسخہ آزاد سے لیا، مختصر یہ کہ تذکرۂ ید بیضا بہت جلد پھیل گیا اور مقبول ہوا، لیکن الہ آباد کے دوران قیام میں آزاد کو "مواد تازہ" ملا اور انھوں نے پہلے نسخہ کو منسوخ کر کے ایک نیا نسخہ تیار کیا، یہ نسخہ ۱۱۴۸ھ/۱۷۳۵ء میں تکمیل کو پہنچا، "طبع کلیم ید بیضا نمود" خود آزاد نے اس کی تاریخ کہی تھی،[2]

۱۱۵۰ھ/۱۷۳۷ء میں آزاد نے حرمین شریفین کی زیارت کا قصد کیا، یہ سفر ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، اور اسی لیے انھوں نے لطف لے کر اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، سفر کی تفصیل جاننے سے پہلے سفر کے محرکات خود آزاد کی زبانی سن لیجیے:

"من فدای جلوۂ احمدی و صید بستۂ فتراک محمدی در عنفوان سن خوابی دیدم کہ در مسجد

---

[1] آزاد: خزانۂ عامرہ ص ۱۲۴، شفیق: گل رعنا [2] آزاد بلگرامی: ید بیضا (قلمی) اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

مکۂ معظمہ زادہا اللہ تعظیماً حاضرم و جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم در محرابی از مسجد قائم اند۔ فقیر شرف ملازمت اقدس دریافتم۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم التفات فراوان نمودند و لب بہ تبسم شیریں کردہ حرفہا پرسیدند۔ ہنوز جمال باکمال خصوص لمعان تبسم مبارک در نظر من است۔ ازاں وقت ہرگاہ ایں رویا بیادمی آمد سلسلۂ شوق می جنباند۔ آخر جذبۂ عنایت محمدیہ مرا از خود در ربود و شرار ناتوانی راہمت برق آسماں سیر کرامت نمود [۱]۔"

اس شوق پر مندرجۂ ذیل واقعہ نے تازیانہ کا کام کیا، شفیق لکھتے ہیں کہ میں نے خود آزاد کی زبان سے یہ واقعہ سنا کہ

اس زمانہ میں (آزاد کے الہ آباد کے دوران قیام میں) نواب مبارز الملک سربلند خاں تونی صوبہ الہ آباد کے ناظم تھے، وہ اپنے لڑکے میر محمود مخاطب بہ شاہنواز خاں کو اپنا نائب بنا کر محمد شاہ کے پاس دہلی گئے، میرے والد محمد نوح نواب شاہنواز خاں کی سرکار میں میر ساماں تھے، ایک دن وہ مجھے اور میرے چھوٹے بھائی میر غلام حسین کو نواب کی خدمت میں لے گئے، نواب بنگلہ میں بیٹھے تھے اور میرے والد ان کے قریب کھڑے کاغذات ان کے دستخط کے لیے ان کے سامنے پیش کرتے تھے، ہم دونوں بھائی کچھ فاصلہ پر "سلام گاہ" میں کھڑے ہوئے اور انتظار کرنے لگے کہ نواب اس طرف نگاہ کریں تو ہم انھیں آداب بجا لائیں۔ نواب دستخط کرنے میں اس قدر منہمک تھے کہ دیر تک اس کا موقع نہ آیا، چوبداروں کا قاعدہ ہے کہ ٹھہر ٹھہر کر اپنے آقا کو اشارہ کرتے ہیں، مثلاً مجرائی کے لیے بلند آواز سے کہتے ہیں' باادب، باقاعدہ، چوبدار نے دو تین مرتبہ صدا لگائی لیکن نواب متوجہ نہ ہوئے، میری غیرت جوش میں آئی کہ مخلوق کے دروازہ پر اس قدر سماجت ولجاجت کرنے کی کیا ضرورت ہے، چنانچہ میں وہاں سے واپس چلا آیا، والد صاحب گھر پر آئے تو مجھ سے پوچھا کہ تم نواب کو آداب بجا لائے

[۱] آزاد: مآثر الکرام ص ۳۰۰۔

بغیر کیوں چلے آئے؟ آخر تمھارا ارادہ کیا ہے؟ میں نے جواب دیا، جو آپ سمجھیں۔ اسی دن میں نے عہد کر لیا کہ فوراً مخلوق کے دروازہ سے کنارہ کشی کر کے خالق کے دروازہ پر چلنا چاہیے [۱]۔

آخر وہ ساعت سعید آگئی، جب آزاد نے درِ مخلوق سے منہ موڑ کر درِ خالق کا رخ کیا، رجب ۱۱۵۰ھ (اکتوبر ۱۷۳۷ء) کی تیسری تاریخ تھی اور دوشنبہ کا دن کہ وہ اس مبارک سفر پر روانہ ہوئے۔ "سفر خیر" مادۂ تاریخ ہے جو خود آزاد نے نکالا تھا، چونکہ انھیں خدشہ تھا کہ اگر ان کے اعزہ واحباب کو ان کے ارادہ کی خبر ہو جائے گی تو وہ مانع ہوں گے، اس لیے انھوں نے کسی کو اپنے ارادہ سے آگاہ نہیں کیا اور تن تنہا بلگرام سے پیادہ پا روانہ ہو گئے، انھوں نے اپنے سفر حج کے تقریباً سارے واقعات ایک مثنوی کی شکل میں لکھے ہیں اور اس کا تاریخی نام "طلسم اعظم" رکھا ہے، اس کی تمہید میں لکھتے ہیں:-

دم صبحی کہ مہر عالم تاب … سر بر آورد از نشیمن خواب

جلوہ گر شد بکرسیٔ مینا … با دل گرم و دیدۂ بینا

داد رنگ صفا بہ چہرۂ زرد … کہ دغوئی ز آب شبنم کرد

بسکہ در سجدہ سود پیشانی … کرد سیمائی خویش نورانی

گرم شد در رہ خدا طلبی … بست احرام جانب غربی

شد جلو ریز سوئی بیت اللہ … بہر دو دیدہ زد قدم در راہ

طرفہ بانگی بگوش ما آمد … از پس پردہ ایں ندا آمد

کای بیابان بستہ در مقام ادب … آتش تازۂ نسیم طلب

گوہرت شبنمی ست قابل دید … خیز از جا کہ خواندت خورشید

[۱] شفیق: گل رعنا

بال برہم زن از طپیدن دل بستہ بر پا اگر بود بگسل

ای صدا شور عشق در جاں ریخت صد گل داغ در گریباں ریخت

دامن ہمتی زدم بر کمر جستم از قید سنگ ہمچو شرر[۱]

آزاد کے گھر سے نکلنے کے تیسرے دن ان کے اقربا و اعزہ کو علم ہوا تو وہ سخت حیران و پریشان ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی سید غلام حسن نے تین منزل تک ان کا تعاقب کیا لیکن چونکہ انھوں نے اسی خیال کے پیش نظر عام راستہ چھوڑ کر غیر متعارف راہ اختیار کی تھی، اس لیے ان کے بھائی انھیں نہ پا سکے[۲]۔ اثنائے راہ سے انھوں نے اپنے عزیزوں کو ایک رقعہ لکھا، جس میں یہ شعر بھی درج تھا:

رفتہ ام از خود چہ می پرسی دگر از حال ما کعبہ می آید دریں وادی باستقبال ما[۳]

آزاد سرونج تک جو حدود مالوا میں واقع ہے پیدل گئے۔ چونکہ پیدل چلنے کی عادت نہ تھی، پاؤں میں آبلے پڑ گئے[۴]، لیکن ایک شوق تھا جو انھیں کھینچے لیے جا رہا تھا، خود فرماتے ہیں:

می بریدم رہی بہ بی پائی با رفیقی کہ بود تنہائی

صبح تا شام راہ می رفتم خوں چکاں تر ز آہ می رفتم

ہمہ کہسار و دشت ناہموار قدم مور دریں رہ دشوار

ہر قدم رود ہا و جیحونہا چوں دم تیغ تشنۂ خونہا

موج خوں تاب و جوش آبلہ ہا ریخت در راہ رنگ سلسلہ ہا[۵]

اتفاق سے انھی دنوں میں نواب آصف جاہ لشکر لیے مالوا میں موجود تھے، لشکریوں میں سے ایک نیک دل نے آزاد کو اپنے مہمان خانہ میں ٹھہرایا، خاطر مدارات کی اور نواب

۱ آزاد: مآثر الکرام ص ۳۰۰، ۳۰۰ ۲ آزاد: مآثر الکرام ص ۳۰۰ ۳ آزاد: ید بیضا، ۴ آزاد: مآثر الکرام؛ ص ۳۰۰ ۵ ایضاً

آصف جاہ کی خدمت میں تقریب کا موقع بہم پہنچایا، ۲۲ شعبان ۱۱۵۰ھ (۲۰ نومبر ۱۷۳۷ء) کو انھیں نواب آصف جاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا، اس موقع پر انھوں نے نواب کو مخاطب کرکے مندرجۂ ذیل رباعی پڑھی:

ای حامی دیں محیط جود و احساں حق داد ترا خطاب آصف شاہاں

او تخت بدرگاہ سلیماں آورد تو آل نبی را بدر کعبہ رساں[۱]

آزاد کہتے ہیں کہ یہ رباعی بیت اللہ کی زیارت کے شوق نے مجھ سے کہلوائی، ورنہ شاعر ہونے کے باوجود میں نے کسی کی مدح میں شعر نہیں کہے[۲]۔ خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں کہ

"درحقیقت نظم ایں رباعی برای تحقیق مضمون آیۂ کریمہ وعلی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا است نہ برای جلب حطام دنیوی"[۳]

نواب آصف جاہ پورے رمضان بھر مرہٹوں سے نبرد آزمائی میں مصروف رہے اور سواد بھوپال جنگ و قتال کا مرکز بنا ہوا تھا، آزاد نے بھی اس معرکہ آرائی میں حصہ لیا تھا، چنانچہ مثنوی طلسم اعظم میں لکھتے ہیں:-

من ہم آں روز در صف اسلام با یکی ذوالفقار خون آشام

قدم پُردلانہ افشردم حملہ ہا بر مخالفاں بردم

تشنگیہای روزۂ رمضان کردہ از کام تا جگر بریاں

سفر کعبہ و صیام و جہاد ایں سہ دولت بہم خدا داد

چونکہ انھی دنوں میں نادر شاہ کی آمد کی خبر مشہور ہوئی اس لیے نظام الملک نے مرہٹوں سے صلح کرنے میں مصلحت سمجھی، چنانچہ آخر رمضان میں صلح ہو گئی، اور نظام الملک نے دکن کا رخ کیا،

۱ آزاد: مآثر الکرام ص ۳۰۶، ۳۰۷ ۲ ایضاً ص ۳۰۷ ۳ آزاد: خزانۂ عامرہ ص ۱۲۹

روانگی سے پہلے انھوں نے آزاد کے سفر کا خاطر خواہ انتظام کر دیا، اور وہ اوائل شوال میں بھوپال سے نکل کر برہان پور آئے، ۱۰ ذیقعدہ کو وہ سورت پہنچے، جہاں سے ۲۴ ذیقعدہ کو جہاز پر سوار ہوئے، ۱۸ محرم ۱۱۵۱ھ (۲۸ مارچ ۱۷۳۸ء) کو ان کے جہاز نے جدہ میں لنگر کیا، یہاں ان کی ملاقات شیخ محمد فاخر الٰہ آبادی[۲] سے ہوئی، جو پہلے سے جدہ میں موجود تھے اور ان کے آنے کی اطلاع پاکر ان کے منتظر تھے[۳]،

۲۳ محرم کو انھوں نے ارض پاک پر قدم رکھا اور ان کی جبین نیاز نے آستانۂ خداوندی کے سجدہ سے تسکین حاصل کی، حرم محترم میں ان کی زبان نیاز نے یہ ترانہ چھیڑا:

الٰہی نالہ گرمی دل دیوانۂ ما را	کرامت کن نہال آتشینی دانۂ ما را
مدہ در دست زنگار ہوس آئینۂ دل را	زحسن خویش کن آباد حیرت خانۂ ما را
کریمان را نظر بر تشنۂ مہمان نمی باشد	مبرا ز باغ بیرون سبزۂ بیگانۂ ما را
دریں بزم کہن از دست مردم آبرو مشکن	تو گردش دہ برنگ آسمان پیمانۂ ما را
دل ما در چراغان تجلی رنگ می بازد	سمندر ساز و در آتش فشان پروانۂ ما را
نمی گنجد اریک دم سینہ را از جنبش آہی	بایں سنبل سراسر سبز کن ویرانۂ ما را

صریر خامۂ آزاد را شور دو عالم کن
نمک دہ از قبول خویشتن افسانۂ ما را[۴]

اس کے بعد کے مراحل کا ذکر خود آزاد کی زبان سے سننا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ حالات کے علم کے ساتھ ساتھ ان کے جذبۂ بے اختیار شوق کا بھی اندازہ ہو جائے، وہ لکھتے ہیں کہ

"از آنجا کہ شوق مدینۂ سکینہ جلوہ ریز بود، طاقت صبر در خود نیافتہ بیست و ششم منہ روز جمعہ

[۱] صاحب شمامۃ العنبر (؟) عثمانی کا بیان ہے کہ پانچ سو روپئے دیئے تھے [۲] ان کے حالات کے لیے دیکھئے سرو آزاد ص ۲۱۰ تا ۲۱۱، ید بیضا، سفینۂ خوشگو ص ۲۹۵، تذکرۂ بینظیر وغیرہ [۳] آزاد: مآثر الکرام ص ۳۰۸ [۴] آزاد: ید بیضا

رو براہ مدینۂ مقدسہ آوردم، بست و پنج ماہ صفر کہ درین تاریخ از کتم عدم بشہرستان ہستی دارسیدہ ام ...... وقت سحر از سواد مدینۂ منورہ سرمۂ سعادت در چشم کشیدم و دیدۂ آرزو منور را بر قبۂ روضۂ اقدس الیوم"[۱]

چونکہ یہ حکایت لذیذ ہے اس لیے آزاد اس کی تکرار سے لطف حاصل کرتے ہیں، خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں:

"چون موسم حج دور بود سہ روز در مکہ معظمہ ماندہ رو بمدینۂ منورہ آوردم و غبار آستان رسالت را کحل الجواہر چشم نیاز ساختم و عید الفطر در حضور اقدس کردہ بام القریٰ عطف عنان نمودم ..... سالم کشمیری حسب حال خود و فقیر گوید:

عید فطر است بر در پیغمبر	شبیا اللہ گفتم بس یاور
ایں عید و مدینہ بخت من طالع من	ان شاء اللہ بمکہ و عید دگر"[۲]

اگرچہ آزاد نے باکمال اساتذہ سے تحصیل علم کر لی تھی اور درجۂ استادی و کمال پر پہنچ چکے تھے لیکن ان کی تشنگیٔ علم ہنوز باقی تھی، چنانچہ مدینہ منورہ کے دوران قیام میں انھوں نے شیخ محمد حیات سندھی[۳] سے صحیح بخاری کا درس لیا اور صحاح ستہ اور "سائر مفردات" کی اجازت لی، ان کی شغف و بے تابی کا حال خود انہی کی زبان سے سننا زیادہ مناسب ہوگا، وہ لکھتے ہیں کہ

"در شہور اقامت ایں بلدۂ طیبہ صحیح بخاری را خدمت مولائی و استادی شیخ محمد حیات السندی المدنی نور اللہ ضریحہ سند کردم و اجازت صحاح ستہ و سائر مفردات مولانا برگرفتم، شبہا در مسجد نبوی مابین بیت و منبر والا می نشستم و بمطالعۂ صحیح بخاری می پرداختم و ایں غزل در مدح اقدس بزبان نیاز ادا شد:

[۱] آزاد: مآثر الکرام ص ۳۰۸ [۲] آزاد: خزانۂ عامرہ ص ۱۲۵ [۳] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو مآثر الکرام ص ۶۷ تا ۱۶۶، سبحۃ المرجان ص ۹۵ تا ۹۶، اتحاف النبلاء المتقین (مصنفہ نواب صدیق حسن خاں) ص ۴۰۳، تذکرہ علمائے ہند (مصنفہ رحمان علی) ص ۱۸۶ تا ۱۸۷ وغیرہ

بہ زد جلوۂ اعجاز شمع مطلبی	نماند شوخی چشم شرار بولہبی
فدای خاصیت وادی عقیق شدم	کہ کرد رنگ دل افشن علاج تشنہ لبی
زیارت تو کند آفتاب ہر شب نذر	ز دود صباح جلو ریز جانب غربی
ز بسکہ ذوق شکست تو داشت ساغر ماہ	گرفت رنگ نزاکت ز شیشۂ حلبی
خوش است حسن تقاضا ز باغبان کریم	نصیب ذائقہ ام کن حلاوت رطبی
بآفتاب نبوت رسانده ایم نسب	توان ز ذرۂ ما دید نور خوش نسبی

بملک ہند چو من نیست طوطی آزاد

کہ کرد تربیت من شکر لب عربی"[1]

۱۴ شوال کو آزاد مدینۂ منورہ سے رخصت ہوتے ہیں، روانگی کے وقت ان کے دل کی جو کیفیت تھی اسے خود انہی کے الفاظ میں سننا زیادہ مناسب ہوگا۔

ثم جاء موسم الحج ودنا ان یتعطر المشام بالاریج فاخذت الرخصة من الجناب الرحیب وطلبت الاجازة من المرعی الخصیب وعینی تھمل ھملان العارض وفؤادی یخفق خفقان الوامض وبت کمن فقد سراجا فی لیلة لیلاء ادرجع صادیا عن سلسال الصلاء واتفق الوداع فی الرابع عشر من شوال وفی ھذا املیت علی لسان الحال

علیک سلام اللہ یا اشرف الوری	لقد سال دمعی فی وداعک ثانیا
وما انا الا کالذی جاء منھلا	فذاق ولکن عاد ظمآن باکیا[2]

۲۹ شوال کو آزاد مکہ معظمہ پہنچے اور حج کے مناسک ادا کرتے ہیں، خود انھوں نے اپنے حج کی تاریخ "عمل اعظم" سے نکالی تھی[3]، مکہ میں ان کا قیام شیخ عبد اللطیف[4] کے مکان پر تھا[5]، یہاں بھی

۱؎ آزاد: مآثر الکرام ص ۳۰۸-۳۰۵ ۲؎ آزاد بلگرامی: سبحۃ المرجان (بمبئی ۱۳۰۳ھ) ص ۱۲۰ ۳؎ آزاد: مآثر الکرام ص ۳۰۹
۴؎ ان کے حالات کے لیے دیکھیے مآثر الکرام ص ۱۶۶، ۱۶۷ ۵؎ آزاد: مآثر الکرام ص ۱۶۲

آزاد کی تحصیل علم کا سلسلہ جاری رہا، یہاں انھوں نے شیخ عبد الوہاب طنطاوی مصری سے فن حدیث میں کسب فیض کیا[1]، آزاد کہتے ہیں کہ جب شیخ کو میرے تخلص کا علم ہوا اور مجھ سے اس کے معنی پوچھے تو فرمایا "یا سیدی انت من عتقاء اللہ"[2]

اس مقدس فریضہ کی ادائگی کے بعد ربیع الاول میں آزاد طائف کی سیر کے لیے گئے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ کے مرقد مبارک پر پہنچے تو اپنے جذبۂ اخلاص وعقیدت کا اس طرح اظہار کیا:

اے صبا رہ بمزار پسر عم نبی	خاک آن روضہ کم از عنبر تر نشناسی
کرده ام خوب تماشای چمن طائف را	نرسد ہیچ گل او بہ گل عباسی[3]

آخر ربیع الثانی میں آزاد مکہ واپس آئے اور طواف وداع بجالانے کے بعد جدہ کو روانہ ہوئے، جدہ میں ۳ر جمادی الاول کو جہاز پر سوار ہوئے، آٹھ روز بعد مخا پہنچے جو یمن کی ایک مشہور بندرگاہ ہے۔ یہاں جہاز نے چار دن لنگر کیا، اس لیے انھوں نے شہر کی خوب سیر کی اور حضرت شیخ شاذلی[4] کے مزار مبارک پر حاضری دی، ۹ر جمادی الاول کو ان کا جہاز سورت پہنچا، ۲ر جمادی الآخر کو وہ شہر سورت میں داخل ہوئے۔ اس طرح آزاد کا یہ سفر (یا بقول آزاد سفر حجاز فیض طراز) انجام کو پہنچا، خود انھوں نے "سفر بخیر" سے تاریخ معاودت نکالی تھی، سورت پہنچکر "ایام ام القری اور تذکرہ عہود حمی" کی یاد میں ان کے زبان قلم پر یہ ترانہ آیا:

من از بوس حجر در کعبۂ دل ارشاد میکردم	مسی مالیده یاقوت کسی را یاد می کردم
زیارت می نمودم کعبہ را از گردش رنگی	بحکم شوق طوف تازۂ ایجاد می کردم
درین وادی الامان مشتاق تیغ قاتلی بودم	ز بیتابی طواف خانۂ صیاد می کردم
چو آواز جرس از کاروان ہم پیش می رفتم	بیاد لیلی محمل نشین فریاد می کردم

۱؎ آزاد: مآثر الکرام ص ۳۰۹ ۲؎ آزاد: سرو آزاد ص ۲۹۳ ۳؎ آزاد: مآثر الکرام ص ۳۱۰ ۴؎ ان کا نام علی بن عبد اللہ
اسکندریہ کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار اولیاے کبار میں ہوتا ہے، ۶۵۴ھ میں وفات پائی (جامی: نفحات الانس کانپور
۱۸۹۳ء ص ۳۷۷)

بصحرا با غزالاں راسلام از دور می گفتم — بگلشنہا زمین بوس گل و شمشاد می کردم

ز عکس غیر صافی داشتم آئینۂ دل را — بصاحبخانہ ایں خانہ را آبادی می کردم

اگر آزاد پائے سعی من از کار وا ماندی

بجائے ہمت والدی خود امداد می کردم [1]

اس کے علاوہ ایک اور غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے:

از حرم آورد سوی دیار ہندستاں مرا — گردش چشم سیاہت کرد سرگرداں مرا [2]

آزاد کہتے ہیں کہ میرے ہندوستان لوٹنے کا سبب یہ تھا کہ اہل وعیال اور خصوصاً والدین کی محبت مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی، دوسرے میں نے یہ خیال کیا کہ چل کر ان کی خدمت کروں اور ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کروں [3]، لیکن سورت پہنچکر انھوں نے اولاً پانچ مہینے وہیں قیام کیا، اور پھر جب وہاں سے نکلے بھی تو دکن کا رخ کیا، شیخ غلام حسن ثمین نے شرائف عثمانی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ نظام الملک نے آزاد کو حج کے لیے رخصت کرتے وقت ان سے استدعا کی تھی کہ واپسی پر وہ اسی رستہ سے آئیں، ممکن ہے کہ سورت پہنچ کر انھیں نظام الملک کی "استدعا" یاد آئی ہو، اور جذبۂ احسان مندی نے انھیں دکن کا رخ کرنے پر مجبور کیا ہو۔

(باقی)

---

[1] آزاد: مآثر الکرام ص ۳۱۰ - ۳۱۱ [2] آزاد: ید بیضا [3] آزاد: سبحۃ المرجان ص ۱۲۱

مقالات شبلی جلد پنجم

یہ مولانا شبلی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو اکابر اسلام کے سوانح وحالات سے متعلق ہیں، اس میں علامہ ابن تیمیہ، ابن رشد اور آزاد بلگرامی وغیرہ کی سوانح عمری جیسے اہم اور مفید مضامین ہیں۔ قیمت:- ۶ر

منیجر

مطبوعات جدیدہ

نصرتی - از ڈاکٹر عبدالحق مرحوم، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۴۴، قیمت صہ شائع کردہ: کل پاکستان انجمن ترقی اردو، کراچی۔

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی قدیم تصنیف "نصرتی" کو جو قدیم دکھنی شاعر ملا نصرتی کے حالات میں ہے، حال میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا ہے۔ اس کے شروع میں نصرتی کے خاندان، ابتدائی تعلیم اور دوسرے حالات اور اس ضمن میں عادل شاہی دور حکومت اور اس کی علم نوازی اور شہر بیجاپور کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، لیکن اس زمانہ کے حالات تاریخوں اور تذکروں میں کم ملتے ہیں اس لیے یہ تذکرہ مختصر اور تشنہ رہ گیا ہے، تاہم تلاش وجستجو سے مصنف کو جو حالات بھی مل سکے ہیں ان کو جمع کر دیا ہے، نصرتی کی تصنیفات گلشن عشق، علی نامہ اور تاریخ اسکندری کا بہت مفصل اور جامع تذکرہ کیا گیا ہے، اور آخر میں اس کے قصائد، غزلیات اور دیگر اصناف کی خصوصیات وغیرہ پر بہت مفید بحث کی گئی ہے، مواد کی فراہمی میں مصنف نے تلاش ومحنت اور تحقیق وتنقید کا پورا حق ادا کیا ہے، کتاب میں نصرتی کے کلام کا خاصہ حصہ نقل ہو گیا ہے، اس لیے اس کے قدیم دکنی الفاظ کی فرہنگ بھی دیدی گئی ہے، کتاب مجموعی حیثیت سے اردو میں قابل قدر اضافہ ہے اور مصنف کا نام اسکی خوبی کی پوری ضمانت ہے،

اردو مرثیہ کے پانچسو سال - از ع۔ س مسلم۔ وحید فاروقی تقطیع کلاں، صفحات ۴۰۰، قیمت ہے ۲۶ر اورینٹل چیمبرز ساؤتھ نیپئر روڈ۔ کراچی

یہ ماہ نامہ نیا راہی کراچی کا خاص اور ضخیم نمبر ہے جو کتابی شکل میں شائع ہوا ہے، اس کے شروع میں مرثیہ کی تاریخ پر بھی مختصر بحث ہے، جس میں اس کی ابتدا، مرثیہ کا موضوع، کردار، عرب و ایران پھر دکن اور دلی میں اس صنف شاعری کی نوعیت و ترقی وغیرہ کے متعلق مفید معلومات جمع کیے گئے ہیں اور لکھنؤ میں میرانیس اور مرزا دبیر کے عہد میں اس فن میں جو غیر معمولی ترقی ہوئی اور ان دونوں کے بعد ان کے خاندان اور دوسرے مرثیہ گویوں نے اس صنف میں جو اضافے کیے، ان کا ذکر ہے، اور موجودہ دور میں اس کی ترقی اور مستقبل میں اس کے امکانات پر بحث کی گئی ہے، اس کے بعد نادر مرثیے کے عنوان سے حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ کی وفات پر اور حضرت فاطمہؓ کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر مرثیہ درج کیا گیا ہے، اور فرزدق کا مشہور مدحیہ قصیدہ حضرت امام زین العابدین کے متعلق اور اہل بیت کی مظلومیت پر بنت عقیل بن ابی طالب کے چند اشعار نقل کیے گئے ہیں، اس کے بعد اردو کے ہر دور کے شاعروں کے سلام مناقب، مناجات، مراثی، قصائد اور رباعیات و قطعات کا انتخاب دیا گیا ہے، فاضل مرتب کے نزدیک چونکہ مرثیہ واقعۂ کربلا کے غم انگیز پیرایۂ اظہار ہی سے عبارت ہے، اس لیے انھوں نے اسی نوعیت کا کلام اس مجموعہ میں شامل کیا ہے، حالانکہ مرثیہ کو محض واقعۂ کربلا تک محدود کرنا صحیح نہیں ہے، مرثیہ کے پس منظر کے طور پر اسلام کے ابتدائی دور کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں شیعی نقطۂ نظر نمایاں ہے، ہر عہد کے مرثیہ گو شاعروں پر جو نوٹ لکھے ہیں اس میں بھی اختلاف کی گنجائش ہے، انیس و دبیر کے متعلق انھوں نے جابجا مولانا شبلی کی رائے سے اختلاف ظاہر کیا ہے، اگر ان کا اختلاف خود قابل بحث ہے، کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی کم نہیں، خصوصاً عربی اشعار تو نہایت غلط لکھے گئے ہیں، ان خامیوں کے باوجود یہ ایک مفید ادبی خدمت ہے جس کے لیے رسالہ کے مرتبین قابل مبارکباد ہیں۔

بستان حرم - از زائر حرم حمید صاحب صدیقی، صفحات ۹۰، کتابت و طباعت عمدہ ناشر ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، قیمت عہ [?]

حمید صدیقی نعت گو شاعر کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، ان کا پہلا مجموعۂ کلام کئی بار چھپ کر مقبول عام ہو چکا ہے، اب انھوں نے بارگاہِ رسالت میں پیش کرنے کے لیے ایک نیا گلدستۂ نعت بستانِ حرم کے نام سے سجایا ہے، اس میں ان کے کلام کا وہی مخصوص والہانہ اور سادہ انداز ہر ہر شعر سے نمایاں ہے، حمید صاحب کے کلام میں لفظی خوبیوں کے ساتھ ایک خاص طرح کی سرمستی اور سرشاری ہوتی ہے، اور پڑھنے والے کے قلب پر اس کا اثر پڑتا ہے، ان کو حرم پاک اور خاص طور پر مدینہ منورہ کے ایک ایک ذرہ سے انس ہی نہیں بلکہ عشق ہے وہ وہاں کی کسی چیز کا ذکر کرتے ہیں تو ان کو آسودگی نہیں ہوتی بلکہ ان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

کبھی جب ذکر آجاتا ہے ان کا
زباں دو دو پہر ہوتی نہیں بند

مگر اس سرمستی و سرشاری کے عالم میں بھی وہ ہوشیار رہتے ہیں، اور ان کا قدم کبھی جادۂ مستقیم سے نہیں ہٹتا، مولانا صبغۃ اللہ فرنگی محلی کی یہ رائے واقعی صحیح ہے کہ ان کو زائرِ حرم کے بجائے شاعرِ حرم کے لقب سے پکارنا چاہیے۔

حیات امجد - از جناب محمد جمال شریف علیگ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۹۴، مجلد، قیمت للعہ [?] پتہ: محمد تلاوت شریف صاحب، سلک [?] عقب مارکٹ حیدرآباد

حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد حیدرآبادی مرحوم اردو زبان کے مشہور اور قادر الکلام شاعر اور ایک صاحب دل صوفی بھی تھے، ان کی شاعری اخلاق و معرفت کا دفتر ہے خصوصاً رباعی گوئی میں اس زمانہ میں ان کا جواب نہ تھا، ان کے ایک عقیدت مند جناب محمد جمال شریف نے ان کی

زندگی ہی میں ان کے حالات اور ادبی خدمات کے متعلق یہ کتاب مرتب کرنا شروع کر دی تھی، لیکن اس کی اشاعت کی نوبت ان کی وفات کے بعد آئی، لائق مرتب نے یہ کتاب خوش مذاقی اور سلیقہ سے مرتب کی ہے، اس میں امجد صاحب کی پاکیزہ زندگی، اعلیٰ سیرت و کردار، اور ان کے کلام اور نظم و نثر کی خصوصیات اور ان کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، امجد شاعری کے علاوہ ایک جامع اوصاف بزرگ تھے، اس لیے ان کے حالاتِ زندگی بڑے سبق آموز ہیں، اور مصنف نے ان کی زندگی اور سیرت کی پوری تصویر کھینچ دی ہے، جن لوگوں کو امجد کے عارفانہ کلام سے دلچسپی ہو ان کے لیے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

کنوز القرآن ۔ از قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی تقطیع کلاں۔ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۳۶، مجلد مع گرد پوش قیمت ۶ غیر مجلد ۵ پتہ (۱) ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکٹ علی گڑھ (۲) مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

قاضی مظہر الدین صاحب استاد شعبۂ دینیات علی گڑھ نے اپنی کتاب "اسلامی کشکول" کے بعد اب یہ دوسری مفید علمی و دینی خدمت انجام دی ہے جس میں اسلامی عقائد، عبادات، اخلاقیات و اعمال اور معاملات وغیرہ کے متعلق مختلف عنوانات کے تحت قرآنی آیات جمع کی گئی ہیں اور ان کے نیچے ان کا اردو ترجمہ اور اسی کے مقابل دوسرے صفحہ پر انگریزی ترجمہ اور پھر دونوں زبانوں میں مختصر تشریح و توضیح بھی ہے، انگریزی ترجمہ اور حواشی زیادہ تر مسٹر عبد اللہ یوسف علی مرحوم کے ترجمہ و تشریح سے ماخوذ ہیں، اردو ترجمہ و حواشی مستند ترجموں کی روشنی میں خود ان کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں جو نہایت سلیس اور شگفتہ ہیں۔ لائق مرتب نے یہ کتاب ترتیب دیکر وقت کی اہم ضرورت پوری کی ہے، اور مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی قرآن کی ہمہ گیر اور بنیادی تعلیمات سے واقف ہونے کا موقع فراہم کیا ہے، اس لیے مسلم و غیر مسلم سب کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

"ض"